DELHI UNIVERSITY LIBRARY

Cl. No. Y:1.2 16€ ;1

Ac. No. E527 Date of release for loan

This book should be returned on or before the date last stamped below. An overdue charge of 0 6 nP. will be charged for each day the book is kept overtime.

DELHI UNIVERSITY
LIBRARY

متحدہ ہندوستانی قومیت

مصنفہ

ڈاکٹر سیّد محمود

آدبی مرکز ہند پبلشرز، بمبئی ۵

انتساب

یاراں کہ بودہ اند ندانم کجا شدند
یارب چہ روز بود کہ از ما جدا شدند

اُن بزرگوں اور احباب کے نام

جنھوں نے ہندوستان کی آزادی اور متحدہ قومیت کے حصول کے لئے اپنی زندگیاں نثار کر دیں۔ جن کے کارنامے تاریخ نہیں بھلا سکتی، گو ہندوستان نے اُن کو بھلا دیا ہے۔

طمعِ فاتحہ از خلق نداریم نیاز
عشقِ من در پیِ من فاتحہ خوانم باقیست

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم۔ مولانا شوکت علی مرحوم مولانا محمد علی مرحوم۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم۔ تصدق احمد خاں شیروانی مرحوم ڈاکٹر سید حسین مرحوم۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم

سید محمود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ چند اوراق

اُٹھائے کچھ وَرق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

یہ چند اوراق عرصہ ہوا مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے مقصد آنے والے خطرات سے آگاہ کر دینا تھا. جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور قارئین دیکھیں گے کہ جو خطرات دلوں میں گذر رہے تھے وہ پیش آ کر رہے۔ کاش اب بھی ہم چونکیں اور ملک کے درخشاں مستقبل کی تعمیر میں ہندو مسلمان دونوں اس طرح لگ جائیں کہ "نیا ہندوستان" دوبارہ گہوارۂ تمدّن بن جائے، جہاں امن اور سلامتی، محبّت اور پریم کا راج ہو اور جہاں زندگی سچائی اور عدم تشدّد (اسیہوگ) کے ٹھنڈے سایہ میں بسر کی جائے۔

ساغر صاحب کے اصرار پر ایک مختصر دیباچہ اور کچھ اشعار کے اضافہ کے بعد ان کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

سیّد محمود

دیباچہ

زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی، مجموعہ ہے اُلٹ پھیر کا۔ ہم ماضی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے بہت سے رنگین، دلکش اور نشاط آفریں خواب نظر آتے ہیں۔ ہاں وہ خواب جو کبھی حقیقت تھے۔ لیکن دستبرُدِ زمانہ نے ان کو اب خواب ہی بنا دیا ہے۔ فلسفی ہو یا شاعر، صوفی ہو یا ادیب، مصلح ہو یا رہنما، جب اُن حقیقتوں کو خواب بن جاتے دیکھتا ہے تو اس کا دل دُکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں پُر نم ہو جاتی ہیں اور دل ہی دل میں اس بُلبل کی طرح نوحہ خوانیاں کرنے لگتا ہے جو خیابانِ چمن میں نسرین و یاسمن کی پنکھڑیوں اور اوراقِ گل پر قطراتِ شبنم کے بدلے "سیلوں کے روتے پھرنے اور بگولوں کے خاک اُڑانے کا" دردانگیز تماشہ دیکھے میرِ ضیاؔ نے شاید احساس کی اسی منزل پر پہونچ کر کہا تھا ؎

یہ ماتم کس دِوانے کا ہے یارب' آج صحرا میں
کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اُڑاتے ہیں

آہ ہندوستان! بدقسمت ہندوستان کے ماضی وحال پر آج میرا دل اسی طرح ایک ہوک میں، اور میری آنکھیں خوں فشانیوں میں مبتلا ہیں جس طرح بخت ری

وخاقانی، کبھی مدائن کی تباہی اور ظفر دہلی کی بربادی پر رویا تھا۔ میرؔ کا شعر ہے؂

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

ابھی بہت دن تو نہیں گذرے، جب راجہ رام نرائن لعل، عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ شاعری کا ذوق تھا اور موزوںؔ تخلّص کرتے تھے، شیخ علی حزیں سے شرف تلمّذ تھا۔ جب نواب سراج الدولہ مارے گئے تو راجہ صاحب بہت روئے اور اسی عالمِ محبّت میں ایک شعر کہہ کر تاریخ معاشرت کی دنیا میں ایک ایسی مثال چھوڑ گئے جو بیک وقت ہمارے لئے درسِ عبرت بھی ہے اور نقشِ راہ بھی۔ خدا جانے راجہ صاحب نے قدس وصفا کی کس دُنیا میں پہونچ کر یہ کہا تھا؂

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانہ پہ کیا گذری

یہ شعر ہندو مسلمان کے ربط واتّصال کی ایک ایسی یادگار ہے جس پر آج ہم سر بھی دُھنتے ہیں اور آنکھوں سے خون بھی روتے ہیں[۱]۔

بندرابن، خوشگوؔ، بارھویں صدی کے ایک تذکرہ نگار اور فارسی زبان کے شاعر ہیں۔ آپ نے جس عظمت، نیاز مندی اور خلوص کے ساتھ اپنے اُستاد سراج الدّین علی خاں آرزوؔ کا ذکر کیا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ہمیں حلقۂ تصوّف کا شیخ ومُرید یاد آجاتا ہے[۲]۔

تذکرہ وتاریخ شعروادب، حکومت ومذہب، معاشرت وتمدّن

---

[۱] تذکرۂ میرحسن [۲] سفینۂ خوشگو

موسیقی و مصوّری، تعمیر و صنعت، الغرض علوم طبعیہ ہوں یا فنونِ لطیفہ و صناعیہ آپ ہندستانی زندگی اور اس کی پیداوار کے جس شعبہ پر نظر ڈالیں گے، آپ کو ہندو مسلمان کے میل جول اثر و تاثّر، جذب و قبول کی ایسی دلچسپ مفید اور سبق آموز یادگاریں ملیں گی کہ آپ عہدِ حاضر کا ملکی و قومی رجحان دیکھ کر بے اختیارانہ کفِ افسوس ملیں گے۔

سیّد محمود

۸

متحدہ ہندستانی قومیت

ایک عرصہ سے ملک میں متحدہ قومیت اور اسلامی تمدن کا شور برپا ہے۔ اور اس سلسلہ میں مختلف ومتضاد خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں۔ ایک بڑا اور سیاسی طور پر منظم طبقہ "متحدہ قومیت" کا علمبردار ہے۔ لیکن اس متحدہ قومیت کے خط وخال کبھی واضح نہیں کئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف "پراچین بھارت" کی تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور دوسری طرف متحدہ قومیت کی دعوت بھی دی جارہی ہے، ظاہر ہے کہ قدیم ہندوستان کی تہذیب متحدہ قومیت ......، کے ساتھ کسی طرح میل نہیں کھا سکتی، بالکل اسی طرح ایک جماعت، اسلامی تہذیب اور مسلم کلچر کا شور مچاتی ہے۔ لیکن کبھی اس نے اس پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ جس چیز کو اسلامی کہہ رہی ہے وہ خالص اسلامی نہیں ہے۔ ہندستان اور خاص کر شمالی ہند میں آج سے نصف صدی پہلے جس تہذیب اور شائستگی کا چلن تھا، اور آج بھی

جس کے دھندلے نشان نظر آتے ہیں اُسے ہم کسی طرح اسلامی چلن اور اسلامی تمدّن کے نام سے موسوم نہیں کرسکتے۔ اور تو اور آج ہندستان میں اسلام کے نام سے جو رسوم و رواج برتے جارہے ہیں انھیں اصلی اسلام سے دُور کی بھی نسبت نہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ وہ تمدّن جو مغلیہ حکومت کے آخری دَور میں دہلی اور اس کے نواح میں رائج تھا اور جو آج سے نصف صدی پہلے تک شمالی ہند اور دکن میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک تہذیب و شائستگی کا معیار بن چکا تھا، کن اجزا سے مرکب ہے اور اس کی ترقی و تکوین میں ہندوستان کی دُو بڑی قوموں کا کتنا حصّہ ہے اور اس تمدّن کی بنیادوں میں جو اینٹ اور چونا لگایا گیا ہے وہ اسی زمین کا تیّار کردہ ہے یا یہ کہ وہ ایران اور عرب کے کارخانوں میں تیّار ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی غور کرنا ہے کہ یہ مشترکہ (ملی جُلی) تہذیب کہاں تک متحدہ قومیّت سے میل کھاتی ہے اور مشترکہ قومی وجود کی ترقی کے لئے اس کی پائیداری و تحفّظ کس حد تک ضروری ہے۔

۷ ہندُستان میں مسلمان

مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں جس حیثیت سے بھی ہوئی ہو۔ لیکن انھیں اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے میں کچھ دیر نہ لگی انھوں نے اسی سرزمین کو اپنا ٹھکانا بنایا اور اس ملک کی ہوا، زبان اور تہذیب انھیں ایسی بھائی کہ کچھ دنوں کے بعد ملک کے اصلی باشندوں اور ان کے درمیان فرق کرنا مشکل ہوگیا۔ مسلمان اور خاص طور پر عرب جہاں گئے اپنی تہذیب اور اپنی زبان ساتھ لیتے گئے۔ آج مصر، شام اور شمالی افریقہ کی اصلی زبانیں معدوم ہیں اور یہ

ملک عرب کا ایک ٹکڑا نظر آتے ہیں۔

ملیبار اور سندھ

لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوئی پہلی بات تو یہ کہ یہاں عرب بہت کم آئے۔ ملیبار کے ساحلوں پر عرب تاجر ظہورِ اسلام سے پیشتر آیا کرتے تھے۔ ان کی ایک نو آبادی وہاں ضرور قائم ہو گئی۔ لیکن ان کے اثرات ساحلی مقامات سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور خود ان نو آبادیوں کی زبان بھی عرب تاجروں کے میل جول سے، ایک مخلوط (ملی جلی) ملیالم کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ مسلمانوں کے آنے کا دوسرا راستہ سندھ کا علاقہ ہے اور صحیح طور پر سب سے پہلے اسی مقام پر عربی اور ہندی تہذیب کا آمنا سامنا ہوا۔ یہاں بھی عربوں نے فیصلہ کرنے میں دیر نہ کی۔ انھوں نے فوراً بدھ مذہب کی طاقت کو توڑ کر برہمنی مذہب اور ویدک تہذیب کے لئے راستہ صاف کیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی امداد نہ ہوتی تو ویدک تہذیب کو بعد کی صدیوں میں یہ عروج حاصل نہ ہوتا اور نہ ہندوستان ایک وحدت کی شکل اختیار کر سکتا۔ سندھ ہی کا علاقہ وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے ایک مشترک تہذیب اور مشترک زبان کا پودا پروان چڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ عرب جغرافیہ نویس اور سیاحوں کی زبانوں سے اس کی تصدیق کرا دی جاتی خاص کر مسعودی، ابن حوقل، مقدسی جیسے تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے سیاحوں کی کتابوں میں اسکی کافی شہادتیں ملتی ہیں۔

خیر، سندھ میں تو عربی و ہندی تمدن کا مقابلہ تھا۔ اسلئے پلّہ برابر رہا۔ فریقین ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔ ہندوستان سے عالم و پنڈت بغداد گئے جہاں انھوں نے علمی کتابوں کے ترجمہ میں مدد دی۔ ایک جرمن مستشرق، ڈی بوئیر لکھتا ہے۔

"عرب، ہندوستان کو دانائی کا صحیح سرچشمہ سمجھتے تھے۔ عرب مصنّفین کی تحریروں سے یہ نظریّہ واضح ہوتا ہے کہ یہ فلسفہ کا مولد ہے۔ پُرامن تجارت کے ذریعہ جس میں اہل عرب ہندوستان اور دیگر ممالک کے درمیان واسطہ تھے اور زمانۂ مابعد میں اسلامی فتوحات کے ذریعہ ہندوستانی علم دور تک پھیلا۔ اس کا بیشتر حصّہ خلیفہ منصور (۷۵۴ء۔۷۷۵ء) اور ہارون رشید (۷۸۶ء۔۸۰۹ء) کے زمانہ میں ترجمہ ہوا۔ کچھ حصّہ تو پہلوی کی وساطت سے عربی میں منتقل ہوا اور کچھ بلا واسطہ سنسکرت سے۔ بہت سے اخلاقی اور سیاسی علوم امثال کے لباس میں ہندوستان کے قصص و حکایات سے لئے گئے۔ مثال کے طور پر ابن مقفّع اور دوسرے علماء نے منصور کے زمانہ میں "پنت شاتنترہ" کی کہانیاں پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیں۔ ہندوستان کے علومِ ریاضی اور نجوم نے عملی طب اور افسوں کے ساتھ مل کر دنیائے اسلام میں غیر مذہبی علوم کے آغاز کی داغ بیل ڈالی۔ برہما گپت کی سدھانت کا نجوم، جس کا ترجمہ منصور کے زمانہ میں فزاری نے ہندوستانی علماء کی مدد سے سنسکرت سے عربی میں کیا۔ بطلیموس کی المجسطی سے پہلے منظرِ عام پر آگیا تھا۔[1]

لہ The History of Philosophy in Islam مصنّفہ ڈاکٹر ٹی جے بوئر۔ ترجمہ انگریزی صفحہ ۹

محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے خلیفہ مامون کے حکم سے سدھانت یا ہندوستانی نجوم کا ترجمہ کیا اور اس پر حواشی و مشاہدات کا اضافہ کیا۔ مسلمانوں میں سنسکرت کے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، البیرونی، الخوارزمی فیضی بدایونی، خانخاناں، عبدالجلیل بلگرامی، اور آزاد بلگرامی کو سنسکرت زبان پر جو عبور تھا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

سندھ میں عربی کے بڑے بڑے شعرا و محدثین پیدا ہوئے۔ رجال، تذکرہ، اور تاریخ کی کتابوں میں سندھ کے محدثین، فقہا، اور شعراء کا حال ملتا ہے بخاری و ترمذی، نسائی و عسقلانی جیسے نقادانِ رجال اور آزاد بلگرامی جیسے ادیب و تذکرہ نگار نے علماء و شعراء کے حالات لکھے ہیں۔ ابو معشر نجیح السندی جیسے محدث، ابو نصر فتح بن عبداللہ سندھی جیسے فقیہہ، ابو عطاء سندھی جیسے شاعر اور ابو علی سندھی جیسے صوفی صافی کے کمالات و تبحر سے کیسے انکار ہو سکتا ہے[۱]

ساتھ ساتھ انھوں نے دیسی زبانوں کی تحصیل کی اور مذہبی کتابوں کے ترجمے کئے یہ زمانہ گو مختصر رہا لیکن اس پہلے امتزاج اور میل جول کی یادگار موجودہ سندھی زبان رہ گئی ہے جو وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان ہے۔ اور خالص عربی رسم الخط (لیپی) میں لکھی جاتی ہے۔

درۂ خیبر

دوسری بات یہ ہے کہ جو قومیں درۂ خیبر سے آئیں، اُن کے پاس خود عربی کے

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ الکبیر بخاری، کتاب المشتبہ عسقلانی اللباب الجزری اور سبحۃ المرجان، آزاد بلگرامی

علاوہ کوئی ایسا جاندار تمدن نہ تھا جو ہندوستان کی اصلی تہذیب کا مقابلہ کرتا درۂ خیبر سے آنے والے مسلمان جس خیال سے بھی آئے ہوں، لیکن بہت جلد انھوں نے اس زمین کو اپنا گھوارہ اور اپنی امیدوں کا مرکز بنایا۔ شروع شروع تو وہ یہاں کی تہذیب و تمدن پر کچھ اثر ڈال سکے، لیکن بعد میں وہ خود یکسر متاثر ہوئے ان کا رہن سہن، زبان، طریقۂ حکومت ہر چیز مقامی حالات سے متاثر ہوئی اور ان کے پاس (باستثنائے چند) کوئی چیز ایسی نہیں رہ گئی جسے ہم خالص اسلامی و عبرانی یا ایرانی و افغانی کہہ سکیں۔ نسلیں بالکل مخلوط ہو گئیں اور تو اور دین بھی ان کا خالص نہ رہا۔ مسئلۂ توحید و یدانت سے متاثر ہوا، محرم، شب برات اور دوسرے نیم مذہبی تہوار دیسی رنگ میں رنگ گئے اور انکی حکومت خالص دیسی حکومت ہو گئی۔ یہ کوئی ہماری صرف اپنی رائے نہیں ہے۔ فرینچ عالم "گستاف لوبون" "تمدنِ ہند" میں بار بار اس کو دہراتا ہے[۱] خود ہندو اہل قلم اور مفکر بھی اسے سمجھتے ہیں۔ شری آر بندو گھوش اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کی فرمانروائی نے بہت جلد اجنبی لبادہ چھوڑ دیا۔ ملک کے بیشتر مسلمان نسلاً ہندوستانی تھے اور ہیں۔ یہاں تک کہ غیر ملکی سلاطین و امراء بھی ذہن، زندگی اور مفادات کے اعتبار سے بہت جلد قریب قریب ہندوستانی ہو گئے۔" (ماڈرن ریویو۔ جنوری ۱۹۳۶ء)

ہندوستان کی مسلم حکومتیں

مسلمانوں نے یہاں حکومت ضرور کی لیکن اس ملک کو اپنا وطن اور

---

[۱] اردو ترجمہ، صفحہ ۳۰۷ - صفحہ ۳۱۲

اپنی امیدوں کا مرکز سمجھکر۔ یہاں نہ تو "نو آبادیات کی وزارت" تھی اور نہ اس ملک سے ایک پیسہ باہر اپنے بھائی بندوں کے لئے انھوں نے بھیجا۔ یہانتک کہ اورنگ زیب نے شریف مکّہ کے ایک وفد کو روپیہ دینے سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ اس ملک میں بھی غریب اور مستحق لوگ کثرت سے ہیں[۱] ۔ ہندوستان کی مسلمان حکومتوں کو کسی طرح غیر ملکی حکومت نہیں کہہ سکتے۔ ان کی پالیسی یکسر وطن پروری پر مبنی تھی۔ اچاریہ پر پھلا چندر کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں

"جس وقت انگلستان کی ملکہ معمولی حقوق کی خاطر اپنی رعایا پر ظلم ڈھارہی تھی، اس وقت اکبر نے عوام کے حقوق تسلیم کئے اور ایسی عادلانہ حکومت کی جس کی مثال آج بھی شائستہ حکومتیں نہیں پیش کر سکتیں۔"

اور یہ اکبر کی کوئی خصوصیت نہ تھی بلکہ "مذہبی رواداری" جس میں مصلحت اندیشی سے کسی طرح فیاضی کی کمی نہ تھی، مسلمانوں کے دورِ حکومت میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ صرف مغل شاہنشاہوں ہی کے یہاں نہیں بلکہ اور مسلمان حکمرانوں کے یہاں بھی موجود تھی[۲] خود بیچارے بدنام عالمگیر کے بارے میں الفنسٹن اپنی "تاریخ ہند" میں لکھنے پر مجبور ہوا کہ "یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کسی ایک ہندو کو بھی محض ہندو ہونے کی وجہ سے موت یا قید کی سزا دی گئی ہو، یا اس کی جائیداد کا ٹیکس دینا پڑا ہو، یا کبھی اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پر آزادانہ عبادت کرنے میں اس پر اعتراض کیا گیا ہو[۳]"

---

[۱] Letters of Aurang Zeb

[۲] Islamic Culture and National Education By P.C. Ray

[۳] Elphinstone History of India

شیر شاہ کی حکومت اور اسکی بلند حکمت عملی کے متعلق کچھ لکھنا آفتاب کو چراغ دکھاتا ہے۔ اور نہ اس مختصر سی صحبت میں اس کی گنجائش ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے بارہا متحدہ طور پر ہندوستان کی حفاظت کیلئے جاں سپاریاں کی ہیں۔ تاریخ کے صفحات ان حقائق سے مالامال ہیں۔ تاریخ فرشتہ کے مندرجہ ذیل حوالے سے ثابت ہوتا ہے کہ وطن کی حفاظت میں کس طرح ہندو مسلمان دوش بدوش سینہ سپر ہوتے اور سر دھڑ کی بازی لگاتے۔

"قریب ایک لاکھ راجپوت رانا سنگا کے جھنڈے کے نیچے تھے، اور سلطان ابراہیم کے بہت سے امراء جواب تک فردوس مکانی (بابر) کے ساتھ شریک نہ ہوئے تھے، رانا سنگا کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے تھے۔ محمود خاں سکندر لودی کا بیٹا بارہ ہزار سواروں کے ساتھ اُس سے (رانا سے) جا ملا۔ اور مارواڑ کا راجہ ویرم دیو میواتی بارہ ہزار (اور بہت سے راجگان) اس کے فرمانبردار ہوئے۔ اور حسن خاں میواتی بارہ ہزار سوار کے ساتھ اُس کی مدد کو آیا۔ اور دو لاکھ سواروں کے ساتھ ہندوستان کو بچانے کیلئے آگرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور چونکہ آنحضرت (یعنی بابر) بعض ہندو امراء پر پورا بھروسا نہ رکھتا تھا۔ اس لئے ہر ایک کو ایک سرحد پر مقرر کر کے خود اُس مغل لشکر کے ساتھ جو کابل سے اس کے ہمراہ آیا تھا اور چاہندی امیر کمال خاں وجلال خاں، سلطان علاء الدین کے بیٹے اور علی خاں فرملی اور نظام خاں حاکم بیانہ کے ساتھ آگرہ سے روانہ ہوئے، جب موضع کانوہ میں پہونچے جو بیانہ کا علاقہ تھا، وہاں قیام فرمایا اور بیانہ کے اطراف میں دونوں فوجوں میں ڈبھیڑ ہوئی۔"

رانا سنگا کے ساتھ حسن خاں میواتی اور دوسرے مسلمان سردار موجود تھے۔حسن خاں میواتی اُسی لڑائی میں مارا گیا۔ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے ہندو مسلمان سب متفق ہو گئے تھے، یہ دلیل اس بات کی ہے کہ پٹھانوں کی حکومت میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات بُرے نہ تھے۔یہی حال ہمیشہ رہا۔ ایک حکمراں دوسرے کو مفتوح کرنا چاہتا۔ ہندو مسلمان کی تخصیص نہ تھی۔نادر شاہ کے مقابلہ میں ہندو مسلمان دونوں لڑے۔اسی طرح احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں مرہٹوں کے دوش بدوش مسلمان بھی لڑ رہے تھے۔

متّحدہ قومیّت

مسلمانوں کی دانشمندانہ پالیسی اور وطن پرورانہ حکمتِ عملی، نیز دیسی زبانوں اور تہذیب کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی، صوفیوں کا عوام سے میل جول، دونوں قوموں کے بلند حوصلہ افراد کا اشتراک، ان تمام چیزوں نے بلا ارادہ ایک مشترک قوم، اور متّحدہ تہذیب کا ہیولیٰ تیار کر دیا۔اور ہم اس وقت پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت یہاں جمنے سے بہت پہلے ایک مشترکہ ہندوستانی قوم تیار ہو چکی تھی۔حادثہ کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۳۱ء) میں صحیح کہا گیا ہے۔

"انگریزوں کے آنے سے پہلے مختلف ریاستوں کے درمیان کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس میں دونوں طرف سے "ہر ہر دیو" اور "اللہ اکبر" کی صدا نہ بلند ہوئی ہو۔اس سے بڑی شہادت یہ ہے کہ جونہی ۱۸۵۷ء میں جنگ کا اعلان ہوا اور بہادر شاہ

کو سارے ہندوستان کا بادشاہ بنا کر عام دعوت دی گئی، تو ساری خلقت بلا تفریق ہندو مسلمان جھک پڑی اور سب نے یکساں طور پر لبیک کہا۔ سب کی زبان پر بہادر شاہ کے سوا کسی مسلمان یا ہندو حکومت کا نام نہیں تھا۔"

غرض انیسویں صدی کے آغاز میں ایک متحدہ قومیت اور مشترک زبان و تہذیب کا درخت بار آور ہو چکا تھا۔ انگریزوں کے آنے کے بعد کیا ہوا، اور کس کس طرح ان دونوں قوموں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی سب کو معلوم ہے۔ مزید تفصیل مقصود ہو تو لالہ لاجپت رائے کی کتاب "بدقسمت ہندوستان" اور "کانپور کی رپورٹ" ملاحظہ فرمائیں جس میں کافی مسالہ فراہم کیا گیا ہے۔ ہمیں اس وقت تفصیلات سے براہ راست تعلق نہیں۔

مشترک تہذیب

ہم نے ابھی لکھا ہے کہ درّہ خیبر سے آنے والے مسلمانوں نے شروع شروع تو کچھ اپنا اثر ڈالا لیکن بعد میں وہ ہندو تہذیب سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بالکل اسی رنگ میں رنگ گئے۔ اس میل جول، تاثیر و تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب ہندوستان آکر اپنا اصلی رنگ قائم نہ رکھ سکی، ہندو تہذیب بھی اپنا قدیم روپ باقی نہ رکھ سکی اور ان دونوں کے میل سے ایک تیسری تہذیب نے جنم لیا۔ جسے ہم "لوبون" کی زبان میں "اسلامی تمدنِ ہند" یا صاف طور پر "انڈو مسلم کلچر" (ہندو مسلم تہذیب) کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ ہندو مسلم تہذیب ہے جو اکبر اور دوسرے مغل بادشاہوں کے دربار میں پرورش پاتی رہی اور آج سے پچاس سال پہلے تک، اعلیٰ

اور متوسط طبقوں میں شائستگی کا معیار قرار دی جاتی رہی۔ آج اسی کو مسلمان اپنی کم علمی کی وجہ سے اسلامی تمدن کہنے لگے ہیں حالانکہ ٹھیٹھ اسلام میں تمدن و تہذیب کی تبدیلی کوئی مذہبی اثر نہیں رکھتی، اور ہندو نادانی سے مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں پیدا شدہ تہذیب کو اجنبی اور پردیسی سمجھکر، پراچین بھارت کا طور طریقہ پھر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر دونوں قوموں کو یکجا رہنا ہے اور ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر دوش بدوش کام کرنا ہے تو اس غلط خیال کا قلع قمع کرنا ضروری ہے دونوں کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ یہ مشترک تہذیب اور اس کی لازمی پیداوار مشترک زبان کوئی اسلامی اور بدیسی سرمایہ نہیں۔ یہ تہذیب اور زبان اسی زمین اور آب و ہوا کی پیداوار ہیں اور ان کی ترقی اور پرداخت میں دونوں قوموں کا برابر کا حصہ رہا ہے۔ نیز جو جماعتیں ملک کی فلاح و بہبود کا کام کرنا چاہتی ہیں ان کا اولین فرض ہے کہ وہ اس "مشترکہ ورثہ" (سرسپرو کی زبان میں) کے بچے کھچے آثار کی پوری حفاظت کریں، ورنہ ہوا کا رُخ کچھ اور ہی بتا رہا ہے ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یہ تو اجمالی گفتگو تھی، آئیے اب ذرا اہم تفصیل سے اس مشترک تہذیب اور اس کے آثار کا جائزہ لیں، اور دیکھیں کہ مسلمانوں کے آنے اور اس ملک میں رہ پڑنے کے بعد یہاں کی عام زندگی، زبان اور طریقِ حکومت میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور وہ کس حد تک خوشگوار کہی جاسکتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان

کے تعلقات باہر سے از سر نو زندہ ہوئے جس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان کی بحری حالت سدھر گئی اور بحری تجارت میں ترقی ہوئی۔

(۲) ہندوستان کے ایک بڑے علاقے، خصوصاً وندھیا کے شمالی علاقے میں اندرونی امن و امان مکمل طور پر قائم ہوا۔

(۳) تمام ملک میں ایک قسم کی حکومت قائم ہونے سے ملک نے ایک سیاسی وحدت اور یکسانیت کی صورت اختیار کرلی۔ نیز بابر اور اس کے جانشینوں نے تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ ملک کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کیا۔ لـه

(۴) مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے زیر سایہ مقامی اور دیسی بولیوں نے بڑی ترقی کی اور ہر علاقہ میں ایک "دیسی ادب" پیدا ہوگیا جو یکسر مسلمان فرمانرواؤں کا فیض تھا۔ بنگال کے مسلمان پٹھان بادشاہوں کی ادبی سرپرستی اور ہندو بنگالی شاعروں پر انعامات کی بارش کے قصّے زباں زدِ خاص و عام ہیں۔ بادشاہوں نے سنسکرت کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرائے۔

(۵) فنونِ جنگ میں ملک نے بڑی ترقی کی، اور اس سلسلہ میں باہر سے آنے والے مغلوں اور افغانوں نے دیرپا اثر چھوڑا، تا آنکہ اصلی باشندے بھی اس میں طاق ہوگئے۔ یہ اور اس قسم کی بیسیوں خوشگوار تبدیلیاں زندگی کے ہر شعبہ میں ہوئیں، جن کا اس وقت احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ترقیاں اور تبدیلیاں مسلمان بادشاہوں کی وطن پروری، رواداری

لـه استاڈرڈ امریکی نے اپنی کتاب "جدید اسلامی دنیا" (The New World of Islam) میں اسکی صراحت کی ہے

اور علمی حوصلہ افزائی کے باعث نمودار ہوئیں، گو آج ان کا اعتراف نہ کیا جائے لیکن تاریخ کی یہ حقیقتیں جھٹلائی نہیں جا سکتیں۔

ہمارا موضوعِ سخن صرف یہ تبدیلیاں نہیں جو آج صرف ایک تاریخی وجود رکھتی ہیں۔ بلکہ ہمارا روئے سخن خاصکر ان تبدیلیوں کی طرف ہے جو دونوں قوموں کے میل جول سے عالمِ وجود میں آئیں اور جن کے آثار آج بھی موجود ہیں اور جن کا تحفّظ و بقا آج بھی ملک کی فلاح بہبود کے لئے ازبس ضروری ہے۔ صرف "اتّحاد اتّحاد" پکارنے سے اتّحاد نہیں ہو سکتا؟ ہمیں اتّحاد کی دعوت دیتے وقت سوچنا چاہیئے کہ کیا ہم واقعی دل سے اتّحاد کے ثمرات کی پرورش و پرداخت کرنا چاہتے ہیں؟ اور کیا ہم اُس رہن سہن زبان اور لباس وغیرہ کو سینے سے لگانے کو تیار ہیں جو صدیوں کے میل جول کے بعد ظہور میں آئے تھے اور جن کے نقوش آج بھی دھلی، لکھنؤ، حیدرآباد میں نظر آتے ہیں۔ اگر اتّحاد کے لئے ہماری دعوت سچّے دل سے نکلتی ہے تو پھر دل کھول کر اور جرأت کے ساتھ اس مشترک زبان و تہذیب کو اپنانا چاہیئے، ورنہ "اتّحاد" اور "متّحدہ قومیت" کی مُبہم دعوت قطعاً بے معنی ہی ہو کر نہیں رہ جائے گی بلکہ اس سے طرح طرح کے شُبہات پیدا ہونے لگیں گے۔

اب ہم خاص طور پر اس ہندو مسلم تمدّن کے ان مظاہر پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں جنھیں بدقسمتی سے مسلمان خالص اسلامی چیز سمجھتے ہیں اور ہندو پردیسی! حالانکہ جیسا ہم اوپر لکھ چکے ہیں وہ نہ اسلامی ہیں نہ پردیسی۔ ان میں قدرتی طور پر سب سے پہلے زبان کا سوال آتا ہے، اسلئے ہم پہلے اسی کو لیتے ہیں۔

زبان مسلمانوں کی یوں تو کوئی زبان نہیں لیکن جو زبان ان کی قومی، ملّی

اور دینی زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے وہ صرف "عربی" ہے۔ اسی میں قرآنِ کریم نازل ہوا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کی یہی زبان تھی۔ عرب جہاں گئے اپنی زبان ساتھ لیتے گئے۔ اس ملک میں عرب سندھ تک محدود رہے۔ تھوڑے عرصے تک وہاں ان کا اثر و اقتدار رہا۔ درّۂ خیبر سے جو مسلمان آئے وہ ترکی فارسی اور افغانی بولتے ہوئے آئے۔ انگریزوں کی طرح چار ہزار میں سے انھوں نے حکومت نہیں کی بلکہ یہیں رہ پڑے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام سے میل جول میں عالموں اور صوفیوں کو دیسی "بھاشا" سے مدد لینی پڑی بسرکاری زبان تو فارسی رہی لیکن مسلمانوں کے ابتدائے قیام ہی میں ایک جمیل زبان کی داغ بیل پڑ گئی، جو اکبر اور اس کے جانشینوں کے عہد میں ایک شستہ زبان کی صورت میں تبدیل ہونے لگی، گو یہ حکومت کی سرپرستی سے محبوب رہی لیکن اس کی جاذبیت اور دل لبھانے والی ادائیں ایسی تھیں کہ ملک کی عام بول چال کی زبان بن گئی اور نہاردی، ہندی، ریختہ، اُردو، اور ہندوستانی مختلف ناموں سے پکاری گئی انگریز آئے تو انھیں بھی ایک عام زبان کی ضرورت پڑی گو اس وقت مسلمانوں ہی کے میل جول سے دوسری مقامی بولیاں بھی زبان کی شکل اختیار کر چکی تھیں لیکن وہ بولیاں مقامی رہیں اور ہندوستانی یا اُردو کی عمومیت کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ اسلئے انگریزوں نے یہی زبان منتخب کی اور اس کو ہندوستانی کا فطری نام دیا۔ آخر جب عرب کی زبان عربی، چین کی چینی، اور جاپان کی جاپانی کہلاتی ہے تو ہندوستان کی عام زبان ہندوستانی کیوں نہ کہی جائے۔ دن گذرتے گئے اور اس زبان کی عمومیّت بڑھتی گئی۔ اور ہندوستان سے گذر کر سیلون، مالدیپ، حجاز، افغانستان

جنوبی افریقہ، پورٹ سعید اور عدن میں یہ زبان سمجھی جانے لگی۔ لیکن خدا کی شان! باہر تو اس کی آؤ بھگت ہوئی مگر دیس ہی میں اسکی جان کے لالے پڑ گئے اور مشکل سنسکرت سے بھری ایک "لنگوا فرنکا" ایجاد کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوگی؟ زبان بنانے سے نہیں بنتی لیکن اس سے بڑا نقصان ہوا کہ صدیوں کے میل جول کی پیداوار ہماری یہ میٹھی زبان آج ملک کا سب سے بڑا مختلف فیہ مسئلہ بن گئی۔ ایک طرف تو ہم مشترک انتخاب اور مشترک قومیت کا اشتہار دیتے ہیں دوسری طرف اس مشترک قومیت وتہذیب کے سب سے اہم مظہر کو خود اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر زبان کے متعلق یہ رویہ جاری رہا تو کسی مشترک محاذ کا قائم کرنا بلکہ قائم رہنا ناممکن ہو جائے گا۔

زبان کے متعلق علمی حیثیت سے پچھلے چند سالوں میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ شاید محنت اور کوشش کے بعد بھی مشکل سے کچھ اضافہ کیا جا سکے[1] اسلئے علمی حیثیت سے تو ہم اس وقت اس بحث پر کچھ اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ اس قدر ضرور گذارش کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ زبان جس کو ہم ہندو مسلمان آج بول رہے ہیں ایک ہزار برس کے میل جول میں بنی ہے۔ اس کے بنانے میں ہمارے ہندو مسلمان دونوں کے بزرگوں کی عمریں بیتی ہیں، یہ ہندوستان میں ہندو مسلم ملاپ کی

---

[1] سید سلیمان ندوی کا مقالہ "ہندوستان میں ہندوستانی" ڈاکٹر تاراچند کی کتاب "ہندوستانی کا مسئلہ" اور مولوی عبدالمالک آروی کا مقالہ "زبان اردو کے ارتقائی منازل"

بڑی یادگار ہے۔

جو لوگ اس کو مٹانا چاہتے ہیں وہ گویا ہندو مسلم تعلقات کو نئے سرے سے الجھانا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ہر صوبہ نہیں بلکہ ہر شہر اور گاؤں میں برابر کی دو قومیں پیدا ہو جائیں گی جو ایک دوسرے کی زبان بالکل نہ سمجھ سکیں گی اور جب ایک دوسرے کی زبان نہ ملے گی تو دل کیسے ملے گا۔

چلتے چلتے ایک بات اور سن لیجئے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو یا ہندوستانی کے ادیب و شاعر صرف اسلامی یا عربی نام اور استعارے استعمال کرتے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ وہ جو غیر ملکی نام استعمال کرتے ہیں وہ سرے سے غیر اسلامی ہیں۔ رستم، اسفندیار، سہراب، لیلےٰ مجنوں، فرہاد، شیریںؔ خسرو، سب کے سب غیر مسلم کردار ہیں۔ علاوہ بریں وہ جہاں عام ایرانی نام اور تلمیحات لاتے ہیں وہاں خالص دیسی بلکہ ہندوی تلمیحات و اشارات بھی آزادانہ کلام میں لاتے ہیں۔ عہد عادل شاہی کا مشہور ایرانی شاعر ظہوری ترشیزی کہتا ہے ؎

بہ شیوۂ دکنی زادگاں نہ نازد کس — دکن بہ طرزِ بتانِ طرازمی بالد

اور یہی نہیں کہ وہ دکن کے رہنے والوں کی اداؤں پر ریجھا ہوا تھا بلکہ دکن اور دکنی زادوں کی محبّت نے اس کے دل سے وطن کی یاد بھی بھلادی تھی خود اقرار کرتا ہے۔ ؎

گرچہ خوبانِ خراساں بر نمک مشہور اند
رفتہ بیروں زسرم شورِ وطن خوش دکنے است

شیخ علی حزیں بڑے تنگ مزاج تھے۔ بادشاہ سے لے کر ہندوستان کے

بہت سے علماء و شعراء سے چڑے ہوئے تھے۔ محمد شاہ دو دو مرتبہ خود اُن سے ملنے گئے، لیکن شیخ صاحب نے ملنا بھی پسند نہ کیا "قطب" کی سیر کا بہانہ کر کے مکان ہی سے چلے گئے۔ لیکن جب بنارس میں آئے تو اس سرزمین سے کچھ ایسی بوئے وفا آئی کہ یہیں رہ پڑے اور پھر یہیں پیوند خاک بھی ہو گئے۔

منشی شیو پرشاد (منیجر اخبار اودھ) نے "کلّیاتِ حزیں" کے آخر میں "خزانۂ عامرہ" آزاد بلگرامی کے حوالہ سے شیخ علی حزیں کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے شیخ کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

از بنارس نہ روم معبدِ عام است ایں جا
ہر برہمن پسرِ لچھمن ورام است ایں جا

شیخ کے بہت سے ہندو شاگرد تھے۔ انھوں نے اس کو شیخ کے مذہبی خیال کا رنگ دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیخ "این و آں" کے دائرہ سے بہت آگے نکل چکے تھے اور آپ کا مشرب رسوم و قیود کی دُنیا سے بہت بلند ہو چکا تھا

ہندوستان کے سب سے بڑے نعت گو شاعر محسن کاکوروی (جنھیں حسانّ الہند لقب دیا گیا ہے) کے قصائدِ نعتیہ، خالص دیسی تلمیحات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اِک طولِ عمل

خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

کیا یہ اشعار اسی پوتر دیش کی شدھ بھاشا میں نہیں ہیں؟ اور کیا یہ خالص ہندی تلمیحات سے بھرے ہوئے نہیں ہیں۔ اسی طرح ذیل کے اشعار کو دیکھئے ؎

کاجل ڈالوں کرکرا، سُرمہ دیا نہ جائے ان نینن میں پی لبسے، دوجا کون سمائے

زرد چہرہ ہے مرا دیدۂ پُر آب کے پاس کھیت سرسوں کا ہی پھولا ہوا تالاب کے پاس

(امانت)

؎

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی ہوں مسلماں مگر بول اُٹھوں جے کالی کی

(امیر مینائی)

؎

میرؔ کے دین ومذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا (میرؔ)

سانولے پن پہ غضب دھج ہے بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھئے، جے ہو کنھیا لال کی

سچ بتا اے میری جمنا، کیا وہی جمنا ہے تو
کرشن کی بنسی کا اِک بہتا ہوا نغمہ ہے تو (ساغرؔ)

ساری اُردو شاعری دیسی تلمیحات وتشبیہات واستعارات سے بھری پڑی ہے۔ مثالیں کہاں تک دی جائیں پھر بھی اعتراض ہے کہ اُردو زبان اور اردو شاعری غیر ملکی ہیرو کے نام اور غیر ملکی تشبیہات واستعارات استعمال کرتی ہے مثلاً رستم وسہراب، شیریں و فرہاد، لیلےٰ ومجنوں دریائے جیحون وسیحون، لالہ وگل، سرو وچمن، قمری وبلبل، یہ چیزیں فارسی کے اثر سے اُردو شاعری میں ضرور

آئیں لیکن ان سے اسلام کا کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ زبان کی وسعت اور اس کے عالمگیر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان جہاں گئے وہاں کی تہذیب و تمدّن کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس سے ان کی فراخ دلی ظاہر ہوتی ہے۔ جب ہندوستان کی زبانوں پر ان کا اثر پہونچا اور جب انھوں نے فارسی و تُرکی و افغانی چھوڑ کر یہاں کی کھڑی بولی کو سنبھالا اور سنوارا تو اس میں بھی بہت وسعت اور فراخگی پیدا کی۔ اُردو میں کم و بیش پچپن ہزار الفاظ ہیں جن میں سے بیالیس ہزار ٹھیٹھ ہندی نژاد ہیں۔ صرف تیرہ ہزار عربی، فارسی انگریزی، پورتگیز و سنسکرت ہیں۔

عربی اور ہندوستانی

پیغمبرؐ اسلام کی پیدائش سرزمینِ عرب میں ہوئی۔ اسلام کی بعثت سے بہت قبل عرب اور ہندوستان کے تعلقات موجود تھے۔ اس کے آثار نہ صرف موپلا اور ملیالم کی سنگین حقیقت میں نمایاں ہیں بلکہ عربی تمدّن اور عربوں کی زندگی کے مختلف گوشوں سے ظاہر ہے۔ عرب قدیم تمدّن کے علاوہ عہدِ اسلام کے عربی ادب، قرآن و حدیث، تفسیر و رجال میں عرب اور ہندوستان کے میل جول کی اہم اور واضح دلیلیں ملتی ہیں۔

عربی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ہندوستانی سے میل جول کا پتہ دیتے ہیں۔ عربی زبان نے جس طرح سُریانی و عبری، حبشی و ایرانی، نبطی و یونانی زبانوں کے مفردات کو اپنے اندر جذب کیا، اُسی طرح سنسکرت کو بھی قبول کیا اور

سب سے زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں سنسکرت کا لفظ موجود ہے عربی میں لفظ "ہند" ہی زبان کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ ایک سَو اونٹ کے جُھنڈ کو "ہند" یا "ہنیدہ" کہتے ہیں۔ ہند، ہندی اور ہندوانی اُس تلوار کو کہتے ہیں جو بناوٹ میں مضبوط اور ہندوستان میں بنائی گئی ہو یا ہندوستانی لوہے سے بنی ہو[۱]۔ قرآن مجید نے ایسے کثیر الفاظ استعمال کئے ہیں جو عربی میں داخل ہو گئے تھے۔ بخاری، سیوطی وغیرہ جیسے محدّثین اور ثعالبی جیسے ماہرینِ لغت نے ان کو یکجا کیا ہے۔ علماء کی ان روایات کے مطابق جیسے کہ اور زبانوں کے الفاظ قرآن میں ہیں۔ ہندی یا سنسکرت کے الفاظ "ابلعی" اور "سندس" کا بھی استعمال موجود ہے۔

ڈاکٹر نکلسن نے تصوّفِ اسلامی کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ بلخ و بخارا تک بُدھ مذہب کے راہب اور ان کی خانقاہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ منجملہ اور مقامات کے یہ بھی وہ مراکز ہیں جہاں بُدھ مت اور تصوّفِ اسلامی کا سنگم ہوا[۲]۔ بلخ میں ایک محلّہ تھا جسکو "ہندوان" کہا جاتا تھا[۳]۔ الجزری کی روایت ہے۔ یقال لها باب هندوان، ينزل فيها الغلمان والجواري التي يجلب من الهند (وہاں ایک محلّہ ہندوان تھا جہاں مضافاتِ ہندوستان سے آنے والے لوگ ٹھہرا کرتے تھے)

آزاد بلگرامی نے سُبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان اور غزالان ہند میں اسلام اور ہند کے علمی و ادبی سنگم پر تاریخی اور جغرافیائی اشارات کئے ہیں۔ اور مذہبیات

---

[۱] لسان العرب [۲] Mystics of Islam ص۲۳ [۳] اللباب مرتبہ مارگیولیتھ و لب اللباب قلمی نسخہ از طاق بستان

اور ادبیات سے کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ الجزری، ذہبی اور عسقلانی نے ہندوستان کے دو صحابیوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک کا نام سرباتک یا سرمانک اور دوسرے کا نام رتن تھا[1] سرباتک کے متعلق الجزری کا بیان ہے کہ یہ قنوج کے راجا تھے دوسرے ہندوستانی صحابی رتن نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اسلامی دنیا میں رتن کی حدیثیں "الرتنیات" کے نام سے متداول ہیں۔

اُردو کے ہندو شعراء

مسلمانوں کے ورود ہند کے بعد، ہندوستان کی دیسی زبان پہلے پہل عربی سے ممزوج ہوئی اسکے بعد فارسی اور پھر بھاشا سے۔ عربی یا فارسی کے اسی میل نے اُردو یا ریختہ کا روپ اختیار کیا۔ عربی زبان کے ہندو شعراء کی طرف ابھی تک کسی تذکرہ نگار نے توجہ نہ کی۔ فارسی کے ہندو شعراء اور ادیبوں سے تاریخ و تذکرے بھرے ہیں۔ مجمع النفایس خان آرزو، سفینۂ خوشگو، بندرابن خوشگو، سفینۂ ہندی بھگوان داس ہندی، اور بہت سے فارسی تذکروں میں ہندو شعراء اور ادیبوں کے حالات ملتے ہیں۔ ان میں بعض اہم، مفید اور دلچسپ تذکرے خود ہندو شعراء اور ادیبوں نے لکھے۔

اُردو شعراء کے تذکروں میں میر تقی کی "نکات الشعراء" بہت معروف اور مستند ہے۔ میر صاحب نے اُردو کے تین نامی ہندو شعراء، انندرام مخلص، لالہ ٹیک چند بہار اور بندرابن راقم کے حالات لکھے ہیں۔ اور ان کا نمونہ کلام دیا ہے

[1] اسد الغابہ فی معرفتہ الصحابہ و کتاب المشتبہ

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان تین کے علاوہ چودہ ہندو شعراء کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اسماء یہ ہیں۔ رائے پریم ناتھ سنتھوکھ۔ رائے بنیوا۔ سیانا تھ سنگھ لالہ سرب سنگھ دیوانہ۔ گھاسی رام خوشدل۔ لالہ بلاس رائے۔ رنگین۔ لالہ خوشوقت رائے شاداب، رائے بھکاری داس عزیز۔ فارغ۔ بدھ سنگھ۔ قلندر، لالہ کاشی ناتھ راجہ رام نرائن موزوں۔ عجائب رام منشی۔ ان میں سے بہت سے اُردو کے اُستادِ فن تھے۔ جن کی اہلیت اور فنّی استعداد کا اعتراف میر تقی جیسے بے لاگ نقّاد اور میر حسن جیسے ماہر فن نے بھی کیا ہے۔ اُردو شاعری اور ادب سے ہندؤں کا شغف، عہدِ قدیم ہی تک محدود نہ رہا۔ بلکہ رتن ناتھ سرشار۔ چکبست۔ دتاتریہ کیفی۔ سپرو اور پریم چند کی اعلیٰ زباں دانی، اُن کی بے مثل طرزِ نگارش، اور مہارتِ فنّی نے اہل زمانہ سے ان کو اُردو زبان کا ناقابلِ فراموش محسن اور معمار تسلیم کرلیا گیا ہے۔ عہد حاضر اور اس کے قبل کشمیری پنڈتوں نے اُردو میں شعر و ادب کے جو شہ پارے پیش کئے ہیں ان کو ضخیم جلدوں میں منضبط کیا گیا ہے۔

انند رام مخلص فارسی کے شاعر، اعتماد الدولہ کے وکیل تھے۔ مرزا بیدل سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ آخر عمر میں خان آرزو کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ میر صاحب اور میر حسن دونوں نے ریختہ میں ان کا ایک ہی شعر دیا ہے ؎

آنے کی دھوم کس کی گلزار میں پڑی ہے ہاتھ ارگجے کا پیالا نرگس لئے کھڑی ہے

لالہ ٹیک چند کے متعدد اشعار "نکات الشعراء" میں ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک شعر سے تلمیح قرآنی پائی جاتی ہے ؎

محبّت کی قلمرو میں جو جاوے گا تو دیکھے گا کوئی آرے تلے چیرا کسی کو کوہ پر پٹکا

• بندرابن راقم دہلی کے رہنے والے تھے۔ پہلے میر صاحب سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد مرزا رفیع سودا کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں ان کے جو بیس اشعار دئے ہیں انہیں بیشتر اشعار ایسے ہیں جن پہ خود میر صاحب کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ میر صاحب کا یہ فیض تھا۔ راقم کے یہ اشعار پڑھیئے ؎

دل کنج قفس میں کر فریاد بہت رویا　　ہنسنے تئیں گل کے وہ کر یاد بہت رویا
پہونچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب　　یارب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے
• کس کے گلے کے قطرۂ خوں ہیں تہہ زمیں　　جوں تکمہ اُگتے ہیں گل او رنگ اب تلک

میر حسن نے آفتاب رائے رسوا کا جو حال لکھا ہے اس کے پڑھنے کے بعد بابا طاہر عریاں اور سرمد شہید کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ توپ خانہ شاہی میں نوکر تھے عشق و محبت میں نوکری ترک کر دی۔ آخر میں یہاں تک نوبت پہونچی کہ جس سے باتیں کرتے "میاں" کہتے اور روتے، رفتہ رفتہ بیخودی کا یہ عالم ہوا کہ ننگے مارے پھرتے اور اسی حالت میں رحلت کی۔ ان کے یہ اشعار پڑھئے۔ کس قدر بے پناہ سوز و درد پایا جاتا ہے ؎

قفس سے دور گئے ہم چمن میں جائے نہیں　　اُڑیں تو اُڑ نہیں سکتے چلیں تو پائے نہیں
وصل میں بیخود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو　　اس دِوانے دِل کو رسوا کس طرح سمجھائیے
وہ کونسی زمیں ہے جو اشکوں سے نم نہیں　　رسوا ابھی اس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں

خوشوقت رائے شاداب کے متعلق لکھتے ہیں کہ چاندپور ندیہ میں پیدا ہوئے۔ نثر خوب اچھی طرح لکھتے ہیں" درہم چشمانِ خود بہ اعزاز و اکرام بسر می برد،

خدا لیش زندہ دارد" اس کے بعد ان کا یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

دیکھ اس کے منہ پہ زلفِ سیہ فام کے تئیں　　کیا زیب دی ہے کفر نے اسلام کے تئیں

میر حسن اس پر یہ تبصرہ فرماتے ہیں" واقعی این کافر مضمونے خوب یافتہ است" اس سے جو پیار اور خلوص ٹپکتا ہے اس سے مذاقِ ادب رکھنے والا ہر شخص لذت پذیر ہو سکتا ہے۔ میر حسن پہلے شاداب کے متعلق لکھتے ہیں" اللہ اسکو زندہ رکھے" اور پھر فرماتے ہیں" کافر نے خوب معنے پیدا کئے ہیں"۔ فارسی میں اپنی محبوب ترین ہستی کو کافر ہی سے خطاب کیا جاتا ہے۔ لفظ کافر جب خدا سے انکار کرنے والے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو حقارت ضرور ٹپکتی ہے۔ لیکن یہی لفظ جب فارسی یا اردو شاعری میں استعمال ہوتا ہے تو اسکے معنی معشوق یا محبوب کے ہوتے ہیں۔

ہندی و بھاشا کے مسلمان شعراء

اگلے سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ پہلے بھاشا اور عربی کا سنگم ہوا یہی وجہ ہے کہ سعد سلمان لاہوری سے لے کر عہد مغلیہ کے دورِ عالمگیری تک مسلمانوں میں بھاشا و سنسکرت کے بڑے بڑے علماء و شعراء پیدا ہوئے۔ آزاد نے سبحۃ المرجان میں سعد سلمانی کے عربی دیوان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے فارسی اور عربی دواوین کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ آزاد کے نانا عبد الجلیل بلگرامی اور خود آزاد بھاشا کے زبردست شاعر تھے۔ آزاد نے" سرو آزاد" میں بلگرام کے ان شعراء کا شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے جنکو بھاشا اور اسکی شاعری میں یدِطولیٰ حاصل تھا

بارھویں صدی عیسوی میں جو نامور ہندی شعراء گذرے ہیں ان کی
تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں ہے مگر ان میں بھی مسعود، قطب علی، اکرم فیض
تین مسلمان تھے۔ امیر خسرو، مُلّا داؤد، خان خاناں عبدالرحیم، رحمن، ملک
محمد جائسی وغیرہ ہندی علم و ادب کے چراغ ہیں۔ کبیر اور ان کے بیٹے مُلّا کمال
کا ہندی بھاشا پر بہت بڑا احسان ہے۔ کتبن، شیخ مرگاؤتی، جھنجھن نے "مدھومالتی"
عثمان نے "چتراولی" محمد جائسی نے "پدماوت" شیخ نبی نے "گیان دیپکا" نور محمد
نے "اندراوتی" اور قاسم نے "ہنس جواہر" وغیرہ مثنویاں لکھ کر ہندی کے گنجینۂ
ادب کو مالامال کر دیا۔ رحمن کے ...... نیتی کے دوہے، تلسی داس کے ہم پلّہ ہیں
رحمن نے مدنا شٹک، بروئے نائیکا بھید اور نیتی سنگرہ، بہت سی منظوم کتابیں
مثنوی میں لکھی ہیں۔ بہت سے مسلمان ہندی کے بھگت بھی ہوئے ہیں۔ ان
عقیدت مندوں میں رس کھان کو طرۂ امتیاز حاصل ہے۔ مئے محبت کے پُر کیف
جام سے سرشار ہو کر یہ "گوپیوں" کے "شیام" کی مدح سرائی میں ایسی دُرفشانیاں
کرتا ہے کہ پڑھنے والا وجد میں آ جاتا ہے۔ ضلع ہردوئی کے موضع پہانی کا قادر
(سنہ ۱۶۶۰ء کے قریب) بھاشا بھوشن لکھ کر ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہندی کے جمیع اصناف
سخن پر قادر تھا۔ آگرہ کے ادیب طاہر نے ۱۶۷۸ء میں "گن ساگر" اور "کوک ساگر"
دو کتابیں لکھ کر ہندی ادب میں گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ مبارک نے "بل شتک"
اور "الک شتک" دو قابلِ قدر نظمیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کی ہندی
نظم کرشن کی تعریف میں بہت مشہور ہے۔ چند اشعار نمونتاً پیش کئے
جاتے ہیں ؎

کرشن جی کی پیدائش کا حال ؎

پھر آیا واں اک وقت ایسا جو آئے گربھ میں من موہن

گوپال منوہر مرلی دھر سکریشن کشورن کیول نین

گھنشیام مراری بنواری گردھاری سندر شیام برن

پربھوناتھ بہاری کان للہ سکھ دائی جگ کے دکھ بھنجن

جب ساعت پرگھٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھریا کی

اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کرشن کنھیا کی

کرشن جی کا بچپن ؎

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بانکپن — کیا کیا کہوں میں کرشن کنھیا کا بانکپن

بانسری کی تعریف ؎

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری — ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری

بم شنکر ہری ہری

جب آنسا نینا دور ہوئی اور آئی گت سنتوکھ ہری

سب چین ہوئے آنند ہوئے بم شنکر بولو ہری ہری

زمانۂ حال کے شعراء میں امیر علی تمیر اور ظہور بخش وغیرہ نے اچھی شہرت حاصل کی ہے [۱]

عہدِ اورنگ زیب میں مرزا عبدالقادر بیدل فارسی زبان کے نامور اور باکمال شاعر گذرے ہیں۔ ایرانیوں نے ہندوستان کے فارسی شعراء میں صرف امیر خسرو

---

[۱] "ہندی اور مسلمان" زمانہ اکتوبر ۱۹۲۹ء

۱۰۔ مرزا بیدل کو شاعر تسلیم کیا ہے۔ مرزا بیدل ایک ہندو بزرگ مہاتما کتھل داس کے بڑے معتقد تھے اور اُن کی روحانی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ رامچندر جی کے حالات جب اُنھوں نے خلق اللہ کے لئے سبق آموز پائے تو "نرگستان" کے نام سے ایک فارسی کتاب نظم میں لکھی اور اس میں اپنے رام بھگت ہونے کا ثبوت دیا۔ اسی کتاب "نرگستان" سے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں جن میں رامچندر جی کی بھگتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اگرچہ پیشتر ایں داستانے — بہ نظم آوردہ ام در یک زمانے
ہمیں خواہم کہ در نثر آورم باز — شوم زیں داستانے پاک ممتاز
بہ عشق رام چوں بلبل سرایم — سرائے غنچۂ دلہا کشایم
چوں اندر گوشۂ نشینم — گل از باغ و بہارِ او بچینم
نہ دارم آرزوئے غیر در سر — فگندم بارہا از سر، سراسر
دریں عرصہ ہنر از پا فتادہ — سخن را مرتبہ از جا فتادہ
مروّت از جہاں برواختہ رخت — زمانہ طرحِ جور انداختہ سخت
دلِ من داغ داغ است اندریں دور — کہ کس برکس نیارد یک نفس غور
ازاں رو گوشۂ بگرفتہ بودم — ز حرفِ نیک و بد وارفتہ بودم
ولی بودے کہ کتھل داس نامی — رفیق و ہمنشین و ہم کلامی
دلِ بیدل بجوش آمد بہ یکبار — کہ سازم نظم ذکرِ شاہِ دلدار
ز ہندوستاں بہ ایراں می نگارم — کہ باشد در جہاں از یادگارم
بہ عشقِ رام گویم ایں فسانہ — کہ باشد دلربا از ہر ترانہ

بود نامش فروزِ مشعلِ روز ـ بہ ہر منزل بود نامش دل افروز[1]

اس کے علاوہ بیدلؔ نے ایک نظم شاہنامۂ فردوسی کی بحر میں لکھی ہے اس کے چند اشعار ذیل میں دئے جاتے ہیں ؎

نہ بد رآم چوں دیگراں بادشاہ ـ بدے مظہرِ ذاتِ پاکِ الٰہ
بود نامِ او کیمیا در جہاں ـ مسِ روح را کیمیا زر نہاں
بہ شش دفتر ایں داستاں گفتہ ام ـ دُرِ بے بہا یک بہ یک سفتہ ام
کزاں ذکرِ با رآم خود در جہاں ـ شوم تا ابد خرّم و شادماں
چوں پرسیدم از عقلِ فرخندہ فال ـ کہ سازد بمن باز تاریخِ سال
بگفتا زہے نرگستانِ رام ـ بگفت آں مرشدِ خاص و عام
نہ ماند ایست در ما بجز عشقِ رآم ـ چہ گویم ازیں بیشتر والسلام

اگر اُردو شعراء کے دیوان اُٹھا کر اس نظر سے دیکھے جائیں تو دو چار شعر کے بعد کوئی نہ کوئی چیز ایسی ملے گی جس کا سراپا تعلق اسی سرزمینِ ہند سے ہوگا۔ یہانتک کہ مراثی میں اہل بیت کا ماتم کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے اساتذہ شعراء انیسؔ و دبیرؔ نے اُن کی سیرت و کردار کو سراپا ہندوستانی سانچہ میں ڈھال دیا ہے۔ اُن کے سوانح و سیرت جس طرح مراثی میں قلم بند کیے گئے ہیں اور انکی وضع و قطع، اندازِ گفتگو، رجحانِ طبع، احساس جذبات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ سرتاسر ہندوستانی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عبّاسِ نامور
خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہِ بحر و بر

---

[1] نرگستان منقول از "راجپوت گزٹ" لاہور، ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۲۸ء

پردہ کا اہتمام ؎

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے — آتا ہو اِدھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے — ناقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے

علی اکبر کی شادی کی نسبتیں ؎

آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و روم سے — شادی خدا جو چاہے تو ہووے گی دھوم سے
زینب کو اس کے بیاہ کا ارمان ہے کمال — ہر دم یہی دعا ہے کہ دولھا بنے یہ لال

علی اکبر ماں سے رخصت ہوتے ہیں ؎

صبر فرماؤ کہ اب تم سے جدا ہوں گے ہم — دودھ بخشو ہمیں بابا پہ فدا ہوں گے ہم
ماں نے چھاتی سے لگا کر کہا صدقے بیٹا — جاؤ رخصت بھی کیا دودھ بھی تم کو بخشا

مدینہ سے رخصت کا سین ؎

بیٹی سے یہ فرما کے چلے قبلۂ عالم — ناموسِ محمدؐ بھی چلے ساتھ بصد غم
صغرا بھی چلی جاتی تھی روتی ہوئی باہم — ہمسائیاں باندھے ہوئے تھیں حلقۂ ماتم
راحت تھی جو سب کو شہ ذیجاہ کے دم سے — اِک بیٹتی تھی ایک لپٹتی تھی قدم سے

میدانِ کربلا کا ماتمی منظر ؎

ماں خاک اُڑاتی ہے پھوپھی غش میں پڑی ہیں — سب بیبیاں حلقہ کئے گرد اُن کے کھڑی ہیں
بُندے اُتارو طوق بڑھاؤ، پدر نثار — چھپنا کہیں جو لوٹنے آئیں ستم شعار
لو الوداع لاش پہ اب آ کے روئیو — لیکن نہ خاک اُڑا کے، نہ چلّا کے روئیو
زانو پہ سر کو شرم سے نہوڑا کے روئیو — قبرِ رسولِ پاک پہ ہاں جا کے روئیو

(میر انیس)

صوفیا اور ہندو فقراء

ہندوستان میں متحدہ قومیت کی پیدائش، ترقی اور اشاعت میں صوفیائے کرام کا بھی زبردست ہاتھ ہے۔ ہندوستان میں عرب اور عجم سے بہت سے صوفیا آئے۔ بہت سے بزرگ خود یہیں پیدا ہوئے۔ زبان کی بناوٹ اور رواج میں ان کا جو حصّہ ہے اس کو ماہرِ لسانیات نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان بزرگوں کی زبانیں یا تو عربی تھیں یا فارسی، لیکن شہروں اور گانوؤں میں پھر پھر کر انھوں نے ایک مشترک دیسی زبان کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے اثرات آپ کو ان کے اقوال و تعلیمات میں ملیں گے۔ شاہ شرف الدّین احمد یحییٰ منیری کی تعلیمات ہندی میں موجود ہیں۔ مسلمان فقراء کا دائرۂ اثر و نفوذ صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ کثرت سے ہندو بھی ان کے حلقہ بگوش تھے۔ ان فقراء نے بہت سے ہندو گھرانوں کی زندگی بچائی ان کو امارت کے درجہ تک پہونچایا، مسلمان بادشاہوں سے ان کو جاگیریں دلوائیں یہ سلسلہ افغان بادشاہوں سے لے کر مغل عہد تک ہندوستان میں جاری رہا۔

دارا شکوہ نے "اپنیشد" کا خود ترجمہ کیا تھا، سنسکرت ادب، ہندو وِدوانوں (علماء) سے اور یوگیوں سے اگر ایک طرف اس کو عقیدت تھی تو دوسری طرف وہ مُلّا شاہ بدخشی پر بھی جان قربان کرتا تھا۔ جہانگیر خود ایک ہندو فقیر "گوشائیں جدروپ" کے مٹھ پر جایا کرتا اور اُس فقیر نے تصوّف کے مسائل کا ویدانیت سے مقابلہ کر کے ایک بلیغ تقریر کی[۱]۔ ڈاکٹر نکلسن نے تصوّف کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے

---

[۱] اقبال نامۂ جہانگیری

بتایا ہے کہ دانۂ تسبیح کا رواج بدھ مذہب سے تصوّف میں داخل ہوا۔ مراقبہ اور جہاں تک تصوّف کی اخلاقی ریاضت کا تعلق ہے بدھ مذہب سے متضاد ہے اسی طرح فنا کا مسئلہ ہندوستان کے ویدانت سے لیا گیا۔

مولانا جامی فرماتے ہیں کہ خواجہ بایزید بسطامی، شیخ ابو علی سندی کو قُل ہُوَ اللّٰہُ اَحَد سکھاتے تھے، اور بو علی سندی (ہندی) ان کو فنا کی تعلیم دیتے تھے [۱] اس سے نکلسن نے نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کے "نروان" کی تعلیم نے صوفیائے اسلاف کو اثر پذیر کیا۔

شیخ برہان الدین، ایک پرہیزگار مسلمان درویش نے راجپوتانہ میں اپنا وہ اثر قائم کیا تھا کہ راجپوتوں کے ایک بڑے حلقے میں ان کی پرستش ہونے لگی تھی۔ موکل جی، ایک راجپوت حکمراں تھا جس نے شیخ سے ایک بیٹے کیلئے دعا کی درخواست کی، خدا نے اس کو بیٹا عطا فرمایا۔ اس کا نام "شیخ جی" رکھا گیا۔ شیخ برہان الدین کا مقبرہ وہاں مرجعِ خاص و عام ہے اور شیخاوتی راجپوتوں کے زرد جھنڈے کے اوپر درویش کا نیلا پھریرا لہراتا ہے۔ اس بزرگ سے اظہارِ عقیدت کے طور پر شیخاوت راجپوت جنگلی سؤر کا شکار کبھی نہیں کرتے۔

عہدِ عالمگیری کے مشہور مؤرخ منشی سبحان رائے بٹالوی اپنی تاریخ میں ایک موضع دیپالی وال کا ذکر کرتے ہیں جو کلانور کے متصل آباد ہے اور جہاں

---

[۱] صفحہ ۱۷-۱۸ Mystics of Islam و نفحات الانس تذکرۂ ابو علی سندی

شاہ شمس الدّین دریائی کا مزار مرجع خلائق ہے۔ آپ لکھتے ہیں:" ہندو مسلمان اس کے بہت معتقد تھے، لیکن ایک ہندو دیپالی نام اپنی ارادت وعقیدت میں تمام ہندو مسلمانوں پر سبقت لے گیا تھا۔ جب شاہ دریائی کا انتقال ہوگیا تو ہندو مسلمانوں کے اتفاق سے ان کا سب سے پہلا مجاور و متولیّ دیپالی ہی قرار پایا جو مذہباً مسلمان نہ تھا۔" مصنّف مذکور پھر لکھتا ہے "مسلمان اولیاء کے مزاروں پر متولی، سجّادہ نشین اور مجاور، عام طور پر مسلمان ہوتے ہیں لیکن اس مزار پُرانوار پر مجاوری کے لئے دیپالی مذکور کی اولاد تاحال قابض و متصرّف ہے چند سال ہوئے مسلمانوں نے ہندو مجاوروں کو علیحدہ کرنے کی بہت کوشش کی یہاں تک کہ اپنے مذہبی دعوے بھی بیان کئے لیکن عالمگیری حکومت کے عمّال نے ان کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ آج (۴۰ سال جلوس عالمگیری) بھی ہندو جماعت ہی اس مزار کی مجاور ہے[1]

جہانگیر کے زمانہ میں چندو مل صوبہ لاہور کا دیوان تھا۔ اس نے عداوت کی وجہ سے گرو ارجن دیو کو قید کر لیا تھا۔ حضرت میاں میر لاہوری نے سات ماہ کی کوششوں کے بعد جہانگیر سے ان کی رہائی کا حکم دلایا۔[2]

شیواجی کے باپ کا نام "شاہ جی" ایک مسلمان فقیر کے نام پر رکھا گیا، شاہ جی کا باپ مالوجی بھوسلہ دولت آباد کے قریب ایلورہ کا پٹیل تھا اور نظام شاہ بحری یا ابراہیم شاہ کے زمانہ میں سلطنت بحری احمد نگر میں، جو بداری یا اسی قسم کی کسی خدمت پر مامور تھا۔ احمد نگر سے ایک میل پر مہدوی لوگوں کا

---

[1] خلاصۃ التواریخ [2] تاریخ دربار امرتسر صفحہ ۸۴

ایک مقام ہے جسکو دائرہ کہتے ہیں۔ وہاں ایک بزرگ شاہ شریف قدس سرہٗ کا مزار پُر انوار ہے۔ ان کی اولاد میں اب تک جاگیر چلی آرہی ہے۔ دو چار گاؤں جاگیر میں ہیں۔ اِسوقت یعنی ۱۵۵۶ء یا آخر صدی میں یہ بزرگ زندہ تھے۔ مالوجی بھوسلہ آپ کی کرامتوں کی شہرت سُنکر اپنی دونوں بیویوں کو شاہی ہاتھی پر سوار کرا کے، دائرہ شریف کے ایک گوشہ میں املی کے درخت کے نیچے قیام کیا کرتا تھا مگر حضرت ابھی اس پر توجہ نہیں فرماتے تھے۔ کئی جمعراتیں وہ برابر حاضر ہوتا رہا اور احمد نگر واپس چلا جاتا تھا۔ جب نصیب یاور ہوئے تو دل کڑا کر کے خدمت میں حاضر ہوا اور اولاد کے لئے دعا چاہی۔ آپ مسکرائے اور فرمایا" اپنی بیوی کو لے آؤ۔ وہ حاضر ہوئی۔ آپ نے دو بچھو اس کے سامنے ڈال دئے اور فرمایا کھا جا!" وہ اُسی وقت کھا گئی۔ انگریزی کتاب میں درج ہے کہ دو بیویاں تھیں دونوں کو دو بچھو دئے گئے۔ دوسری نے خوف سے نہیں کھایا تو پہلی نے وہ بھی کھالیا...... ایک روایت مرہٹی کتاب میں یوں ہے کہ ایک پھل حضرت نے دیا اور فرمایا کہ اسکو کھالو، دونوں بیویوں نے نصف نصف کھایا۔ درگاہ شریف کے مجاور یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت پان کھا رہے تھے آپ نے اسی کی اُگال دی دونوں نے نصف نصف کھالی۔ انگریزی کتاب میں ہے کہ ایک بیوی کے دو بچے ہوئے، دوسری روایت ہے کہ دونوں بیویوں سے نو ماہ کے بعد دو بچے ایک ہی دن پیدا ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد مالوجی اپنے دونوں بچوں کو قدمبوسی کے لئے لایا اور نام رکھنے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے نام کے دو ٹکڑے ہیں۔ وہی نام ان بچوں کا رکھنا چاہئے۔ اس لئے بڑے کا نام "شاہ جی" اور چھوٹے کا نام" شریف جی" رکھا گیا۔ شاہ جی بعد کو بیجاپور کی عادل شاہیہ

سلطنت کا ملازم ہوا اور شریف جی بھی ملازم ہوا لیکن وہ کسی لڑائی میں مارا گیا۔ انھیں کی اولاد میں بھوسلہ خاندان کے راجہ شیواجی، ستارہ میں پیدا ہوئے اور کولہاپور اسٹیٹ کا موجودہ خاندان شریف جی کی نسل سے ہے۔ ناگپور کے بھوسلے بھی اسی خاندان سے ہیں۔ اب بھوسلہ خاندان کے لوگ سینکڑوں گاؤں میں آباد ہیں اور جاگیر دار ہیں۔ اُن کے خانہ دیوتا جسکو وہ گھرت دیوت کہتے ہیں، یہی بزرگ شاہ شریف ہیں۔

تعمیر

تمدّن و تہذیب کا دوسرا اہم مظہر تعمیر ہے۔ گو ظاہری طور پر فنِ تعمیر کا قوم کے باطنی خصائص سے کوئی خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ تعمیر کے ذریعے قوم کی باطنی طبیعت (Instinct) اور اس کی مدنی خصوصیات کا بدرجۂ اتم اظہار ہوتا ہے۔

اسلام ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ یہی حال اس کے آرٹ کا اور اور لازمی طور پر فنِ تعمیر کا ہے۔ اس کا مطالعہ علمی اکتساب کی حیثیت سے انسانی بہبود کے لئے حد درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ صلاح الدّین (ماہر فنِ تعمیر) اسلامی فنِ تعمیر کو پانچ حصّوں میں تقسیم کرتا ہے، شامی، مصری، مغربی (جو ہسپانیہ اور شمالی افریقہ کو شامل ہے) ایرانی، عثمانی (ترکی) اور ہندوستانی

پروفیسر ستار خیری فرماتے ہیں "اسلامی فنِ تعمیر ہندوستان کے اندر اپنے انتہائی عروج کو پہونچا۔ اندلس کا قصر الحمراء حیرت انگیز طور پر خوبصورت ہے"

قاہرہ کی بعض مساجد حقیقتاً پُرشکوہ ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہیول نے کہا ہے "ہندوستان میں عرب آرٹ کی تمام عظیم الشان عمارتیں عرب، ترکستان، مصر اور اندلس کی تمام عمارتوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ قسطنطنیہ اور قاہرہ کی مسجدیں۔ بیجا پور، دہلی، فتح پور سیکری اور احمد آباد کی مسجدوں کے مقابلہ میں نقشہ کے اعتبار سے مُبہم اور بے کیف، اور ساخت کے لحاظ سے ناتواں ہیں۔ قصر الحمرا کی رنگین استرکاریاں اور ہندسی تناسب کی پُرکاریاں، ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے محلوں کے لطیف تصوّرات، لطافت و وقار کے سامنے بے تنوّع اور افسردہ نظر آتی ہیں۔"

اسلامی فنِّ تعمیر میں جاندار تصویروں کے بجائے تزئین و تجمیل کیلئے عربی حروفِ تہجّی کا استعمال اندلس سے لے کر ہندستان تک جاری و ساری تھا اور اس نے بہت سے ممتاز خطّاط پیدا کئے۔ یہی وجہ ہے کہ فنِ تعمیر میں طغرائی زینت کو Arabesque کہتے ہیں۔ نوکیلا محراب وہ طرز ہے جسکو اسلامی فنِّ تعمیر کی خاص خصوصیّت کہتے ہیں۔ اسکاٹ کا بیان ہے کہ "کسی قوم نے اپنے محلوں کی مکمل زینت، ان کے سجیلے خاکوں اور غیر معمولی حسن و جمال میں مسلمانوں کی طرح امتیازی شان نہیں پیدا کی۔ دیوار کا استرکاری سے سنوارنا بنانا، مسلمانوں کی تعمیر کی وہ خصوصیّت ہے جو مغرب میں نظر آتی ہر چمکیلی اینٹوں کا استعمال بھی اسلامی آرٹ کی خصوصیّت ہے۔ بعض متضاد رایوں کے باوجود، طاق مسلمانوں کے طرزِ تعمیر کی خصوصیّت ہے۔ پھاٹک کا نیم قبّہ نما طرز اسلامی فن تعمیر میں بہت اہمیّت رکھتا ہے۔ فرگوسن نے اس کی

مدح سرائی کی ہے۔ یہ مکمل طور پر ایک مسئلہ کا قابلِ اطمینان حل ہے اور یہ ہر دور میں معماروں کی مہارت اور جولانیٔ طبع کا آئینہ سمجھا گیا ہے اس کو تمام قوموں کی بہ نسبت عرب معماروں نے کامیابی کے ساتھ طاق اور قبہ کی عجیب و غریب ساخت میں پیش کیا ہے۔ اپنے کام کے بناؤ سنگار اور مضبوطی و پائداری دونوں لحاظ سے مسلمانوں کی بہ نسبت کسی آرٹسٹ نے زیادہ اثر و نمود کے ساتھ طاق کا استعمال نہیں کیا ہے۔ گھوڑ نعل محراب، دندانہ دار محراب، باریک نوکیلے محراب، کھڑکی کا قوس اسلامی فنِ تعمیر کی پیداوار ہیں اور بقول اسکاٹ مستند بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ نوک دار محراب جو گاتھ تعمیر کی نمایاں شکل ہے یورپ میں مغلیہ یا ہسپانیہ کے ذریعہ رواج پذیر ہوا [1]

لی بان، اے مولر، خان کریمر، ہور، ڈوزی اور دوسرے علمائے تاریخ و آثار نے اسلامی آثار و تعمیرات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسکو سامنے رکھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر نے ہندوؤں کے طرز، مثل اور مذاق سے میل جول کے بعد ہندوستان میں ایک جدید فن تعمیر پیدا کر دیا۔ محمود غزنوی اپنے حملوں کے دوران میں ہندی طرزِ تعمیر سے اسقدر متاثر ہوا کہ وہ متعدد معمار اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔ یہاں اس نے ان معماروں سے مسجدیں اور محل بنوانے میں مدد لی۔ رفتہ رفتہ ایک ہندی عربی (Indo Saracenic) طرزِ تعمیر منظرِ عام پر آ گیا جس کی اچھی مثالیں اجمیر کی بڑی مسجد اور دہلی کا قطب مینار ہیں۔ پرانی دہلی میں اس ہندو مسلم میل کی بہترین مثالیں نظر آسکتی ہیں اسلامی گجرات کا

---

[1] Islamic Architecture مؤلفہ پروفیسر ستار خیری صفحہ ۱۱۰۳

پایۂ تخت احمد آباد، راجپوتانہ کے کاریگروں کا بنایا ہوا ہے[1] اور وہاں کی عمارتوں میں عربی اور چینی طرزِ تعمیر کی آمیزش صاف نظر آتی ہے۔ گستاف لوبون کی رائے کے مطابق، ہندوستان کی اسلامی عمارات ہندوعربی ایرانی طرزوں سے مخلوط ہیں، کہیں عربی طرز غالب ہے کہیں فارسی، کہیں ہندی[2] ابتدائی دور میں اثر اور میل کے لحاظ سے مختلف جگہوں میں عربی اثرات مختلف ہیں۔ مثلاً جنوب یعنی دکن پر اسلامی اثر بہت کم ہوا وہاں کی ہندو عمارتوں میں اسلامی لگاؤ بالکل نہیں۔ تمدن کے اور شعبوں کی طرح تعمیر نے بھی مغلوں کے عہد میں ترقی کی لیکن اس دور کی ہندو عمارتیں بھی عام طور پر صاف مسلم اثر کا پتہ بتاتی ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے اثر کے ساتھ ساتھ ایک نئی فنی بیداری کی غمازی کرتی ہیں۔ ہندو عمارتوں پر یہ اثر کسی ایک حصہ میں محدود نہیں۔ عجیب بات ہے کہ یہ اثرات راجپوتانہ، وسطِ ہند اور دوسرے ہندو مرکزوں میں زیادہ نمایاں ہیں، اور تو اور متھرا، بنارس، بندرابن کی عمارتوں میں بھی نیا رنگ صاف محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح مسلمان صرف باہر سے ایرانی اور عربی اثرات ساتھ نہیں لاتا بلکہ ہندوستان کا اثر قبول کرنے کے بعد ایک نیا طرز بلکہ چند نئے طرز ایجاد کرتا ہے جس پر ہندو اثرات بہرحال نمایاں ہیں۔[3]

بابر تو خیر باغبانی کا شائق تھا۔ ہمایوں کی زندگی پریشانی ہی میں گذری اکبر کے عہد میں صحیح طور پر ہندو مسلم طرز الگ نہیں کیا جا سکتا۔ فتح پور سیکری کی

---

[1] صفحہ ۳۲۷ (Aryan Rule in India) [2] تمدن ہند

[3] ڈاکٹر تارا چند "اسلام کا اثر ہندوستان پر" صفحہ ۱۳۸

مسجد، اکبر کے ذوق کا اچھا نمونہ ہے۔ ہیول (Havell) کی رائے میں یہ مسجد، مسجد سے زیادہ "وشنو مندر" معلوم ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہندو اور جین آرٹ کا اثر اکبر اور اس کے جانشین کے زمانے کی عمارتوں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ ونسنٹ اسمتھ، شیخ سلیم چشتی کی قبر کے ہندوانہ طرزِ تعمیر پر اظہار کرتا ہوا لکھتا ہے "اتنے بڑے پُر جوش مسلمان فقیر کے مقبرہ میں ہندو اثرات دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ عمارت کی پوری ساخت ہندو جذبہ کو ظاہر کرتی ہے اور کوئی شخص ستونوں کے ہندوانہ اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ [۱]

خود اکبر کا مقبرہ (سکندرہ) پرانے بدھ "ہارون" کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے وقت میں جو ہندو طرز ذرا عدم توازن کے ساتھ نمایاں ہو گیا تھا اسے شاہجہاں نے اپنی تعمیری ذہانت سے دور کرنے کی کوشش کی اور اس نے اپنے پاکیزہ ذوق اور سچی محبت کے جوش میں جو چیز تیار کی وہ صرف ہندوستانی عمارتوں ہی کی سرتاج نہیں بلکہ بجا طور پر عجائباتِ عالم میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا معمار جو بھی رہا ہو لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ مغل طرزِ تعمیر کا معجزہ اور ہندو مسلم طرزِ تعمیر کی متناسب آمیزش کا نمونہ ہے۔

شاہجہاں کے بعد ہندو مسلم طرز اس طرح سمو گئے کہ اب ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو گیا۔ اور ان دونوں کے میل کا نتیجہ آج "مغل طرزِ تعمیر" ایک مستقل طرزِ تعمیر شمار کیا جاتا ہے۔ جس کا تحفظ ہر محبِ وطن کا فرض ہے۔

---

[۱] Akbar. The Great Mughal

مصوّری

عربوں میں کوئی مصوّر نہیں ہوا، لیکن اسلامی آرٹ میں عربی مصوّری بھی ایک حیثیت رکھتی ہے اور اس کی بعض یادگاریں عربی زبان کی قلمی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان قلمی نسخوں میں مشہور ترین "مقاماتِ حریری" کا قلمی نسخہ ہے جو پیرس کے قومی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کی کتابت ۱۲۳۷ء میں ہوئی۔ یہ کتاب جیتی جاگتی تصویروں سے بھری ہے۔ مصوّری کے اس اسکول میں پُرمعنی انداز کے ساتھ بڑی بڑی شکلوں کی جاندار تصویریں نظر آتی ہیں۔

مسلمان اپنا فنِ مصوّری ایران سے ہندوستان لائے اور اسلئے عہدِ ساسانی کے معنوی اسکول اور چینی اثرات نے مل جل کر جو ایرانی مصوّری کا ہیولیٰ تیار کیا تھا وہ عہد اسلام کی مقامی ایرانی و اسلامی خصوصیات سے ہمکنار ہوا اور ایران کے یگانۂ روزگار مصوّر بہزاد نے اسکی تکمیل کی۔ جامع التواریخ رشید الدّین وطواط، شاہ نامۂ فردوسی، ہما و ہمایوں خواجو کرمانی، اور خمسۂ نظامی کو تصویروں سے مزّین کیا جانے لگا۔ ان کے قلمی نسخے یورپ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ہندوستان میں مغلوں نے دوسرے شعبۂ آرٹ کی طرح مصوّری کو بھی فروغ دیا۔ اکبر نامہ، تزک جہانگیری، اقبال نامہ، شاہجہاں نامہ میں مصوّروں کے حالات جمع کئے گئے اور اس لئے لارنس بنین کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ "چونکہ دینی اعتبار سے مسلمانوں کی روحانی زندگی میں مصوّری کو کوئی دخل نہیں اس لئے شاذ و نادر مصوّروں کے حالات ضبط کے لائق سمجھے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سوانح حیات

کے گئے اضطراب، آخری حد تک مواد کی کمی ہے [1]

ابوالفضل، معتمد خاں، ملک صالح کنبوہ، وغیرہ نے مصوّروں کے حالات جمع کئے ہیں۔ جہانگیر کو مصوّری کے فنّی نکات پرکھنے میں کمال حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ عبدالرّحیم خان خاناں کو بھی بہت بڑا مذاق تھا[2] ابوالفضل کی روایت کے مطابق چنگیز نامہ، ظفرنامہ، رزم نامہ، رامائن، نل دمن، کلیلہ ومنہ، عیار دانش کو مصوّر کیا گیا۔[3]

ہندومسلم فن کا ابتدائی نمونہ بہزاد اسکول میں ملتا ہے جس میں چینی کے ساتھ ایرانی آرٹ کا امتزاج کیا گیا ہے۔ بعد کو ایران اور وسط ایشیا کے فن کے ساتھ ساتھ راجپوت مصوّروں کے ہاتھوں خاص ہندی خصوصیات بھی اس میں جذب ہونے لگیں۔ ان مختلف دیسی بدیسی اثرات کے ماتحت مغل طرز نے ترقی کی اور بال و پر نکالے اور بہت جلد تعمیر کی طرح مصوّری میں بھی مغل طرز نے اپنی انفرادیت قائم کرلی۔ ہمایوں نے خود بھی تصویرکشی سیکھی تھی۔ جہانگیر تو اس فن میں دقیقہ سنج تھا اکبر اور جہانگیر کے دربار، ہندو اور مسلمان مصوّروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ابوالفضل نے دربار اکبری کے مصوّروں کی فہرست دی ہے اور ان میں چار مصوّروں کو ممتاز بتایا ہے۔ جن میں میر سیّد علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد، دسونتھ اور بساون کے اسماء نظر آتے ہیں۔ دسونتھ ایک کہار کا لڑکا تھا۔ وہ دیوار پر تصویریں بناتا۔ ایک دن

---

[1] صفحہ ۶۶ Persian Art [2] کلمات الشعراء (تذکرہ خان خاناں)
[3] E.B. Havell: Indian Sculptor and Painting

اکبر کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس کی ذہانت دیکھ کر بادشاہ نے اسکو خواجہ عبدالصمد کے حوالہ کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ سب مصوّروں پر سبقت لے گیا۔ لیکن اس پر جنون کا غلبہ ہوا اور اس نے خودکشی کر لی۔ اس کے بہت سے شاہکار ہیں۔ بساون کو منظر نگاری، صورت کشی، تقسیم رنگ، مرقع سازی اور چند دوسری شاخوں میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ ابوالفضل ان چاروں مصوّروں کے ساتھ مفصّلہ ذیل مصوّروں کو بھی ماہر فن اور ممتاز بتاتا ہے۔

کیشو، زال، مشکین، فرّخ، مادھو، جگن، مہیش، کھیم، کرنی، تارا، سانولا، ہربنس۔ جنوبی کنسنگٹن کے وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم میں اکبر نامہ کا ایک حصّہ ہے جس میں تقریباً ایک سو دس تصویریں اور نقشے ہیں۔ یہ انھیں مصوّروں کے تراوشِ قلم کا نتیجہ ہیں جن کو ابوالفضل دوسرے درجے میں رکھتا ہے۔ لیکن ان میں چند ایسے نقوش بھی ہیں جن پر بساون کے دستخط ثبت ہیں۔ اے بی ہیول نے اپنی کتاب میں چند تصویریں دی ہیں۔ ان میں سورج مل ولد رانا امر سنگھ کی ایک شبیہہ ہے جو ایک ہندو مصوّر "ننھا" نے بنائی ہے۔ اس کے چاروں طرف حاشیہ میں فارسی اشعار مرقوم ہیں جو خطّاطی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ایک دوسری تصویر ہے جس میں معماروں کی ایک ٹولی شاہی محل کی ایک دیوار چن رہی ہے۔ ہیول کا خیال ہے کہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کو قید کیا تھا۔ یہ تصویر اسی تاریخی واقعہ کی منظر کشی کرتی ہے۔ حالانکہ معمولی نگاہ سے دیکھنے میں بھی اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس پر ایک دوسرے ہندو مصوّر "منوہر بندہ" کے دستخط ثبت ہیں۔

لیکن تعمیر کی طرح یہ طرز بعد کی صدیوں میں اپنی شان قائم نہ رکھ سکا جسکی

بڑی وجہ مسلمانوں کے یہاں مذہبی حیثیت سے تصویر کشی کا ممنوع ہونا ہے۔ مسلمانوں کے دورِ عروج میں دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی مصوّری کو ترقی نہ ہوسکی۔ بادشاہوں کی سرپرستی جماعت کی جماعت کا نقطۂ نگاہ بدلنے سے عاجز رہی۔

اس سلسلہ میں ایک اہم بات رہی جاتی ہے۔ مغل طرز تو یقیناً بعد کو پنپ نہ سکا لیکن راجپوت طرز ایک عرصہ تک اپنی مستقل انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ یہ کہنا تو بے سود معلوم ہوتا ہے کہ راجپوت طرز میں مغل طرز کے اثرات صاف نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس اثر اور میل کی خاص وجہ یہ ہے کہ اکبر نے مسلمان مصوّروں کے ذریعے ہندوؤں کی ادبی کتابوں کو مصوّر کرایا۔ اور ہندوؤں کو مسلمانوں کی ادبی کتابوں کی تصویر کشی پر مامور کیا، اس سے دونوں طبقوں کو ایک ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا اور دونوں طرز ایک دوسرے سے متاثر ہوئے۔

سماج

تمدّن کا اثر روزمرّہ کی زندگی پر جتنا ظاہر ہوتا ہے، اتنا شاید کسی چیز میں نہیں۔ آپ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی ہندوستانی زندگی کی جس شاخ کو لیجئے گا یہ گنگا جمنی تہذیب ہر جگہ نظر آئے گی۔ تصنیف و تالیف جیسی علمی چیز سے لے کر تیوہاروں شادی بیاہ ہر جگہ اثر و تاثر کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔

(الف) ہم تصنیف سے شروع کرتے ہیں۔ ایک طرف ہندو مصنّف فارسی کتابوں کو مسلمانوں کے دستور کے مطابق حمد و ثنا، سے شروع کرتے ہیں اور دوسری طرف مسلمان لکھنے والے اپنی ہندی کتابوں کی ابتدا "گنیش" "سرسوتی" یا کسی دوسرے

ہندو دیوتا کے نام سے کرتے ہیں۔ اس طرح حمد وثنا یا گنیش و سرسوتی کی تعریف کوئی مذہبی چیز نہیں رہی تھی بلکہ فارسی اور ہندی کتابوں کا الگ الگ طرز تھا جس میں کسی مذہب یا قومیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(ب) یہ تو خیر ودوالوں اور اونچے لکھے پڑھے لوگوں کی رواداری تھی۔ اب آپ ذرا ایک قدم نیچے اُتر آئیے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں ذات پات کا ادنیٰ تصوّر بھی نہیں، قرآن کی تعلیم ہے "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمکو مختلف قومیں اور خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے بڑا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ [1]

رجال اور حدیث کی کتابوں میں اس آیت کے متعلق وضاحت پائی جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام کے ساتھیوں میں ایک "ابو ہند" تھے پیشہ کے اعتبار سے یہ حجام بھی تھے اور بنی بیاضہ (قبیلہ) کے غلام بھی، پیغمبر صلعم نے قبیلہ والوں سے کہا "اے بنی بیاضہ ابو ہند سے شادی بیاہ کرو۔ [2]

امام سیوطی نے اس سلسلہ میں "معرفتہ السنن" بیہقی کے حوالہ سے ایک حدیث روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب رسولِ خدا صلعم نے قبیلہ بنی بیاضہ کی ایک عورت سے ابو ہند کی نسبت ٹھہرائی تو وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا ہم اپنی لڑکیوں کو غلاموں سے بیاہ دیں۔ اسی اصلاح و ترقی کے لئے سورۂ حجرات کی یہ آیت اُتری جو اوپر درج کی گئی۔ اور بنی بیاضہ کے اس غلام کی شادی قبیلہ کے آزاد

---

[1] سورۂ حجرات پ۲۶ [2] الایقاب ابن عبدالبر قرطبی و اُسد الغابہ الجزری

اور سر برآوردہ گھرانے میں ہوگئی۔ [1]

اسی طرح قرآن کریم میں انقلاب معاشرت کا یہ پیام دیا گیا "کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں کہ جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔ [2]

اکابر محدثین و مفسرین، بخاری، ابن جریر، ابن منذر، طبرانی، سیوطی وغیرہ کی تحقیق کے مطابق یہ آیت زینب بنت جحش اسدیہ قرشیہ کے باب میں اتری بی بی زینب پیغمبر اسلام صلعم کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ آپ نے ان کی شادی اپنے غلام زید بن حارثہ رض سے کرنا چاہی تو خود بی بی زینب، ان کے بھائی عبداللہ اور خاندان والوں کو یہ بات بری معلوم ہوئی اور انھوں نے مخالفت کی۔ لیکن اسلام تو معاشرت میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتا تھا اور انسانیت کو مساوات اور اخوت کی سطح پر لانا چاہتا تھا، اس لئے پُر زور الفاظ میں اس نسبت پر زور دیا۔ اِدھر قرآن کی اس آیت کا اُترنا تھا کہ یکایک یہ مغرور خاندان رام ہوگیا۔ اور ایک غلام کی شادی قریشی گھرانے کی ایک معزز خاتون سے ہوگئی۔ اور پھر دیکھا دیکھی سالم مولیٰ، ابی حذیفہؓ اُسامہ بن زیدؓ اور بہت سے جو غلام اور غلام زادے تھے، اونچے گھرانے کی عزت دار خواتین سے بیاہے گئے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا اور پہلی چند صدیوں میں تو خود سادات و شیوخ کے گھرانوں نے اس طرح سے غیر نسل کے لوگوں کو جن میں کثرت سے غلام اور لونڈیاں نظر آتی ہیں اپنے اندر جذب کر کے ایک عالمگیر انسانی

---

[1] الدر المنثور جلد ۶ مطبوعہ مصر [2] احزاب پ ۲۲ ع ۵

اخوت، مساوات و برادری کا مظاہرہ کیا کہ آج صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں [1]

آپ مساوات کے انساب پر غور کریں گے اور نجیفی و عمیدی، ابن میمون و ابن معیّہ اور رضاعی و ابن عساکر کی تصانیف کا جائزہ لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح سادات کبار اور بنی ہاشم نے ذات پات کے اس بندھن کو سرے سے ختم کر دیا تھا۔ ائمہ اثنا عشری میں، امام موسیٰ کاظم سے لے کر امام مہدی آخری امام تک ائمہ، لونڈیوں ہی کے بطن سے تھے۔ اسی طرح خلفائے عباسیہ میں سفاح، مہدی و امین کے علاوہ تمام خلفاء کی مائیں ایرانی اور حبشی کنیزیں تھیں [2]

اندلس کے اموی خلیفہ کے متعلق صاحب الدراری، کا بیان ہے۔ ولم یلیها (الخلافه) یزید و ابراهیم بن الولید ولا ولیهما من بنی امیه بالاندلس من امه صرة اصلا [3]

لیکن مسلمان ہندوستان میں آئے تو یہاں ذات پات کے بندھن کا گہرا اثر تھا۔ اس سے مسلمان بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے اس بارے میں قابل غور امر یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمان کی مساوات اور باہمی بھائی چارہ کا ہندوستان کی پرانی آبادی پر اثر پڑا کہ ان کے سخت بندھن ڈھیلے پڑ گئے اور خود ان کے متعدد فرقے اور رہنما پیدا ہوئے جنھوں نے اس چھوت چھات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ دوسری طرف خود مسلمان یہاں کی آب و ہوا سے اتنے متاثر ہوئے کہ خود ان کے اندر ہندوؤں

---

[1] صحاح الاخبار نسخہ طاق بستان [2] تحفۃ النظر فا بمعرفۃ الخلفاء، الابن عساکر (قلمی نسخہ) طاق بستان
[3] الدراری فی ابناء السراری (قلمی نسخہ طاق بستان)

کی طرح ذات پات کا امتیاز اور فرق پیدا ہوگیا۔ اس ملک کے مسلمان دعویٰ تو مساوات اور اسلامی برادری کا کرتے ہیں، مسجدوں میں ان کے یہاں ابھی برابری ضرور باقی ہے لیکن مسجدوں سے باہر یہ برابری صرف دکھاوے کی ہے۔ ہندوؤں کی طرح ان کے یہاں بھی ایک ذات کی شادی دوسری ذات کے یہاں نہیں ہوسکتی سادات کے ایسے گھرانے موجود ہیں جن کے یہاں ڈھائی تین سو برس سے باہر رشتہ ہوا ہی نہیں۔ اور یہ دعویٰ تاریخی سند کی بنا پر صحیح ہے۔ ایسے سادات، شیخ ومغل سے کیا رشتہ کریں گے وہ خود دوسرے سیّدوں کو اپنے سے "ہیٹا" اور کمتر خیال کرتے ہیں۔ صاف مذہبی احکام کے مقابلہ میں ان کے یہاں چھوت چھات کی بُرائی تو پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کم از کم شادی بیاہ کے بارے میں تو مسلمان یکسر اسی ملک کی رسم و رواج سے اثر پذیر ہوئے ہیں اور اب تک یہ اثر باقی ہے۔

(ج) جب ذات پات کا ذکر آگیا ہے تو اس نیم مذہبی میل جول کے بعض دوسرے اثرات بھی دیکھ لئے جائیں۔

ہندوؤں کے یہاں بیواؤں کی شادی ممنوع ہے، اور مسلمانوں کے یہاں اس کی سخت تاکید آئی ہے لیکن آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے یہ حال ہوگیا تھا کہ مسلمان بیواؤں کی شادی کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ کوئی سوا سو برس کی مسلسل کوششوں کے بعد پھر یہ سنّت زندہ ہوئی ہے۔ تاہم شریف اور کھاتے پیتے خاندانوں میں اب تک بیواؤں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ دوسری طرف ہندو، ودھواؤں کی شادی کو عام کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ مسلمان اپنی جگہ سے اتنا ہٹا کہ اب تک اس کے اونچے طبقے اسکو

معیوب خیال کرتے ہیں، دوسری طرف ہندو اتنا کھسکا کہ اس کے یہاں بھی ودھوا آشرم کھلنے لگے۔ اور بعض اصلاح یافتہ فرقوں جیسے برہمو سماج میں تو دوسری شادیاں عام طور پر ہونے لگیں۔

(د) وراثت اور ترکہ کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ مسلمانوں کے یہاں قرآنی احکام کی رو سے لڑکیوں کو ترکہ دینا فرض ہے۔ ان کے یہاں عورت اپنی شخصیت اور جائداد کی مالک ہوتی ہے اور آج بھی کم از کم بہار اور یوپی میں مسلمان خواتین اپنے آبائی املاک کا آزادانہ تصرّف کرتی ہیں لیکن ہندوؤں کے میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملیبار میں اولاد کی جگہ بھانجے اور بھانجیاں ترکہ پانے لگیں۔ پنجاب اور اودھ میں لڑکیوں کو ترکہ سے یک قلم محروم کر دیا گیا۔ اور آج متعدد شریعت بل اور علماء کی مسلسل جدوجہد کے باوجود پنجاب، اودھ اور دوسرے ساحلی علاقوں میں مسلمان عورتیں ترکہ سے محروم ہیں۔ یہ صورتِ حال ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے مسلم علاقے میں شاید ہی نظر آسکے دوسری طرف ہندو جن کے یہاں عورتیں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتیں اور نہ ان کے یہاں جائداد میں لڑکیوں کا ترکہ ہے عورتوں کے حقوق خصوصاً حقِ میراث کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں یہ مسلمانوں کا اثر نہیں تو اور کیا ہے؟ عورتوں کے ترکہ میں بھی دونوں قومیں اپنی اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں۔

(ر) ہندو مسلم تیوہاروں کے موقع پر یہ میل اور گنگا جمنی تہذیب ذرا صاف نظر آتی ہے۔ آج سے سو برس پہلے ہولی اور محرّم جیسے تیوہاروں کو دونوں قومیں مل جل کر مناتی تھیں۔ یہ مواقع صرف مذہبی مراسم ہی کے نہیں رہ گئے تھے بلکہ سماجی

میل جول اور باہمی رواداری کا ایک مرقع ہو گئے تھے جیسا کہ اُس وقت کی تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

ٹی، ڈی براؤٹن نے اپنی کتاب میں سندھیا کے دربار کے مشاہدات کا عجیب دلچسپ مرقع کھینچا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ مرہٹے محرّم کا تہوار احترام کے ساتھ منایا کرتے تھے۔

جب فروری ۱۸۰۹ء میں ہولی کا تہوار محرّم کے دنوں میں آپڑا تو اس موقع پر اُنھوں نے ناچ مجرے سے احتراز کیا جو ہولی کا ایک لازمہ تھا۔ ریاست کا ہر باشندہ جس میں خود مہاراجہ بھی شامل تھا ایک فقیر کی طرح محرّم میں سبز لباس پہنتا تھا اور تعزیہ دیکھنے جایا کرتا تھا۔ یہ ایک مثال ہے جو سندھیا کے ساتھ خاص نہیں تھی۔ اُسوقت کی تہذیب ہی یہ تھی [1]

گوالیار کا محرّم آج بھی مشہور ہے۔ مسلمانوں کی سلطنت ختم ہو چکی تھی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ باتیں مسلمان بادشاہوں کی تقلید یا اُن کے اثر میں کیجاتی تھیں۔ مرہٹے اُسوقت آزاد تھے لیکن تہذیب و کلچر پر ایک دوسرے کا اثر اتنا غالب تھا کہ یہ باتیں معمولات میں سمجھی جاتی تھیں۔ نہ کہ کسی سیاسی پالیسی کی بنا پر ان پر عمل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے موقع پر لکھنؤ میں آج بھی ہندو بھائی آپس میں گلے ملتے ہیں۔ مسلمانوں کا عید میں معانقہ کرنا اور ہندوؤں کا ہولی میں گلے ملنا ایک چیز ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں شادی بیاہ میں اور سسرالی رشتوں سے جو ہولی آئے دن

---

[1] ایک مرہٹہ کیمپ سے مطبوعات ۱۸۰۹ء صفحہ ۵۱ - اور ملاحظہ ہو" انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدّن کی تاریخ" از عبداللہ یوسف علی صفحہ ۷۹

کھیلی جاتی ہے، کیا وہ اس ہولی (تہوار) کی نقل نہیں ہے۔ بہار میں شریف مستورات مذاق و تفریح کے اس خاص رنگ کو آج بھی "دھرکھیل" سے تعبیر کرتی ہیں۔

(س) جب مذہبی اور نیم مذہبی تہواروں کا یہ حال ہے تو پھر شادی بیاہ کے جلوس صحیح طور پر ہندو مسلم تہذیب کا سنگم تھے اور آج بھی یہ میل کافی حد تک نمایاں ہے۔ مسلمانوں کے یہاں شادی میں جتنی رسمیں ہوتی ہیں سب کی سب یکسر ہندی اور اسی زمین کی پیداوار ہیں۔ سہاگ پوڑہ، سہرا، کندوری، شامیانہ، سلامی، رونمائی وغیرہ ان میں سے کوئی رواج باہر سے نہیں آیا۔ ان میں سے کچھ خالص ہندوآنہ ہیں جیسے سہاگ پوڑہ، شامیانہ اور سہرا، اور کچھ وہ جو مسلمانوں نے اسی آب و ہوا میں پیدا کیں جیسے سلامی اور رونمائی وغیرہ۔ شادی کی رسموں کا اگر تقابلی مقابلہ کیا جائے تو مشابہت صاف معلوم ہوگی۔ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ آج بھی ہندو گھرانوں کی شادیوں میں سازوسامان، آرائش، سہرا، شامیانہ، برات اور برات کا جلوس اکثر چیزیں مسلمانوں سے ملتی جلتی ہیں۔ بعض چیزیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے لی ہیں اور بعض چیزیں انھوں نے بھی اسی میل جول سے متاثر ہوکر نکالی ہیں۔

لباس ظاہری وضع و قطع

قوموں اور افراد کی ذہنی خاصیتوں کا بڑا ذریعہ لباس ہے۔ لباس کا قوموں کے دماغی لگاؤ سے بڑا گہرا تعلق ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ تہذیب کا رُخ کدھر ہے؟

شروع شروع تو مسلمان ایرانی لباس و طرز رہائش کو ترجیح دیتے رہے لیکن بعد کو آہستہ آہستہ زندگی کی دوسری شاخوں کی طرح ان کا لباس بھی مقامی اثرات

کے ماتحت تبدیل ہونے لگا۔ مختلف زمانوں کی تصویروں کو دیکھنے سے یہ حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ مغل دور کی مصوری بڑی حد تک واقعیت (Realism) پر مبنی تھی ۔ اس لئے ان تصویروں کے لباس اس عہد کی پوری پوری نمایندگی کرتے ہیں۔ ان تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے بعد سلاطین نے خالص ہندوستانی وضع و قطع اختیار کر لی تھی۔ اکبر کا تو کچھ کہنا ہی نہیں اس کی تصویر اور لباس اس کے پیش روؤں سے بدرجہا مختلف ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اونچی ترکمانی کلاہ کی جگہ چھوٹی بندھی ہوئی راجپوت پگڑی نے لے لی۔ بڑھی ہوئی ڈاڑھی بھی منڈنے لگی اور اس کے بدلے ایک "گل مونچھ" بنا یا گیا۔

اگر آپ اس عہد کے ہندوستانی مسلمانوں کی پگڑیوں کا مقابلہ بخارا اور دوسرے ماورالنہری مقامات کی پگڑیوں سے کریں تو فرق اور بھی صاف ہو جائے گا۔ عورتوں کی وضع بھی راجپوت عورتوں کے لباس سے بہت متاثر ہوئی۔

اسی طرح رفتہ رفتہ ہندو مسلمان دونوں پر ایک دوسرے کے لباس کا یہ اثر پڑا اور دونوں نے ایک دوسرے کی وضع...... کو اسقدر اپنایا کہ شمالی ہند ہی نہیں بلکہ تمام شہروں میں ہندو مسلمان متوسط گھرانوں کا لباس بالکل ایک ہو گیا۔ شمالی ہند اور دکن کے شہروں میں یہ اثر اب سے دس بیس سال پہلے تک اتنا نمایاں تھا کہ دونوں قوموں کے درمیان بسا اوقات فرق کرنا مشکل تھا اور آج بھی اتنے اختلاف اور دلوں میں کدورت کے باوجود دہلی، لکھنؤ، اور حیدرآباد کے شرفا، کا لباس کم و بیش یکساں ہے، پنجاب و سرحد میں بھی لباس کی یکسانیت قائم ہے۔ بعض تفصیلات میں فرق ضرور ہے مگر زیادہ باتیں ایک طرح

کی ہیں۔

یہ خیال صحیح نہیں.....کہ یہ میل جول صرف اونچے طبقے میں محدود رہا اور دیہاتوں میں اس کا اثر نہیں پڑا۔ اس لئے کہ دیہاتوں میں مکمل اتحاد اور یکسانیت موجود ہے۔ فرق جو کچھ نظر آتا ہے وہ شہری دیہاتی کا، امیر غریب کا کسان زمیندار کا۔ جوں ہی غریب کسان کا بچّہ دیہات سے نکلا، کچھ تعلیم پائی اور دو پیسے ملنے لگے پھر وہی اچکن اور ٹوپی۔ اس بارے میں لباس اور زبان کا معاملہ بہت ملتا جلتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اُردو شمالی ہند کے شہروں کی زبان ہے۔ دیہاتوں میں زبان، ادبی ہندی سے زیادہ قریب ہے۔ جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ دیہاتوں اور شہروں کی بولیاں کہیں یکساں نہیں ہوتیں۔ شہر کی منجھی ہوئی زبان سے دیہات کی بولی ضرور الگ ہوگی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دوسری زبان ہے۔ راقم نے بہار اور یوپی کے مشرقی اضلاع میں اس کا تجربہ کیا ہے۔ عظیم آباد بہار کا مرکز (کندر) ہے اور بلیا یوپی سرحدی ضلع ہے۔ لیکن ہم نے دونوں ضلعوں کی دیہاتی بولیوں کا شہری زبان سے مقابلہ کر کے اندازہ کیا ہے کہ دیہاتی بولی کے اکثر الگ الگ ٹکڑے شہری بولی میں موجود ہیں۔ بلکہ بعض فقرے فارسی نما ان کی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ صرف صورت بگڑ گئی ہے۔ بہار کے ایک گاؤں کی مثال دوں۔

ایک غریب ہندو کسان سے پوچھا گیا "کہو بھائی ابکی ربیا (ربیع) کا حال چال کیسا ہے؟" ہندو کسان نے جواب دیا "ججور (حضور) بس اہی (یہی) کھچر مچر ہے"۔ پھر پوچھا گیا "بھائی یہ کھچر مچر کیا؟" جواب ملا "اہی ججور تھوڑا بہت"

پھر پوچھا گیا " یہ تھوڑا بہت کیا جی ؟ "جواب ملا " اہی کدرے کلیں (یہی قدرے قلیل) سرکار ـــــ "

یہ جرح بالارادہ کی گئی، دیکھیں وہ کہاں تک اپنا مطلب صاف ادا کرتا ہے ؟ گذشتہ کئی سالوں میں راقم نے دیہاتیوں سے بارہا گفتگو کی اور ہمیشہ یہ یقین بڑھتا گیا کہ موجودہ دیہاتی بولی کا ادبی ہندی سے اتنا بھی تعلق نہیں جتنا موجودہ شہری زبان سے ادبی عربی کا ہو سکتا ہے۔

بہرحال بات کہاں سے کہاں آگئی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ لباس کا اتّحاد شہروں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ دیہاتوں میں بھی اس کی ایکتا ظاہر ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ غربت کے باعث قدیم اثرات غالب رہے۔ قصبات میں تو نمایاں طور پر شہری لباس رائج ہوا بلکہ رائج ہے۔

اس ہندو مسلم ایکتا کی دوسری یادگاروں کی طرح لباس کا اتّحاد بھی آج آخری سانسیں لے رہا ہے۔ لکھنؤ اور الٰہ آباد جیسے مرکزوں تک میں تبدیلی نمایاں ہے۔

بہرحال مسلمان تو عربی عمامہ و جبّہ ہی نہیں بلکہ چغہ اور ترکمانی کلاہ بھی عرصہ ہوا چھوڑ چکے، اور اب وہ ہندوستانی شروانی، ہندوستانی اچکن، ہندوستانی ٹوپی، ہندوستانی پگڑی اور ہندوستانی پائجامہ پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ اب یہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے، چاہیں تو ایکتا قائم رکھیں، چاہیں پھر ہزار دو ہزار سال پہلے کے طور طریقے زندہ کریں۔

یہ بھی یاد رہے کہ لباس کا یہ مسئلہ صرف ان لوگوں سے متعلق ہے

جو دیسی لباس پہننے میں ذلّت نہیں محسوس کرتے، ور نہ انگریزی ہوٹ پہننے والوں کے لئے اچکن کیا دھوتی سب برابر ہے۔

اوپر لباس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ رہن سہن کے طریقے اور سماج کی تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق حرف بہ حرف صحیح ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ رہنے سہنے، کھانے پینے، شادی بیاہ، عید ہولی، دیوالی شب برات، روزانہ زندگی کی ہر شاخ میں یکسانیت آگئی تھی گو مسلمانوں کو اس کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی انھوں نے اس ایکتا کی قیمت اپنے عقائد کی پاکیزگی کی صورت میں دی۔ اپنے مذہبی احکام کی مخالفت کی، نئی نئی مذہبی رسمیں پیدا کیں۔ محرّم کی بدعتیں فرائض میں داخل ہوگئیں۔ شب برات کی آتشبازیاں بھی دینِ خالص کا جزو بنادی گئیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اکبر کے بعد ہی سے بعض مسلمانوں نے ان ہندو اثرات کو دُور کرنے کی کوشش کی، جوان کے مذہب کا جزو بن گئے ہیں۔ آج بھی ان مصلحین کے ماننے والے اور جانشین اپنی اپنی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ صدیوں کا بیٹھا ہوا رنگ دُور ہونا کچھ آسان نہیں۔ ہندو اثر مسلمان عوام وخواص میں اس درجہ سرایت کرگیا ہے کہ بڑے بڑے مولوی اور پرچار کرنے والے اس کے دُور کرنے سے عاجز ہیں لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ........ مسلمان بھی ایکتا کی نشانیوں کو ٹھکراتے رہے ہیں۔ خالص مذہبی چیزوں کو چھوڑ کر وہ اتحاد کی دوسری نشانیوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے اور اس کا بہ قدرِ ضرورت سیکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ لیکن اس کے باوجود "ہندوستانی" کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے اس کی خدمت میں مصروف

ہیں جبکہ ملے جلے خاندان کے دوسرے افراد اس مشترک فرزند کو جیتے جی چھوڑ دینے کی فکر میں ہیں۔ اسی طرح لباس کو لیجئے، مسلمان جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں۔ شروانی، اچکن، کُرتا، پائجامہ، پنجابی صافہ کو اپنی چیز سمجھتے ہیں۔ عربی رومال، عقال سروال اور جبّہ کا انھیں خیال بھی نہیں آتا۔ تعمیر و تمدّن کی دوسری شاخوں کا بھی یہی حال ہے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کے مذہب اور اس کے مختص قانون (نکاح، طلاق، خلع، میراث، اوقاف، وغیرہ وغیرہ) کو آپ خالص اسلامی رہنے دیجئے۔ اس کے بعد وہ اس ہندو مسلم ایکتا کی نشانیوں کو جو دونوں قوموں کی صدیوں کے میل جول کی یادگاریں ہیں۔ اپنے سینوں سے لگانے اور سینہ سپر بننے کے لئے تیار ہیں۔ دونوں قومیں اپنے اپنے مذہب کی پابند ہوتے ہوئے بھی ملی جلی تہذیب کی ان یادگاروں کو قائم رکھ سکتی ہیں اور کسی متحدہ جدّوجہد (United Struggle) میں ایک ساتھ کام کر سکتی ہیں۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب کانگریس قائم ہوئی تو اس وقت بھی مذہبی عالموں نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا مسلمانوں کا فرض ہے اور آج بھی مذہبی علماء کا بڑا گروہ ہندوستان کی ترقی کا علم بردار اور محافظ ہے۔ ان کی مذہبیت اس متحدہ جدّوجہد (United Struggle) میں مانع نہیں آتی۔

بات بڑھتی جاتی ہے۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ متحدہ قوم بنانے کیلئے اتحادِ مذہب ضروری نہیں۔ علاوہ اقتصادی مسائل کے زبان، لباس اور رہن سہن کی یکسانیت ضروری ہے۔ سب سے بڑا عنصر زبان کا ہے۔ اگر یہ مسئلہ حل ہو جاتا

ہے تو بہت سی مشکلیں خود بخود دُور ہو جاتی ہیں۔

یہ چند اشارات تھے، اس ہندو مسلم تمدّن کے متعلق جو پچھلی سات آٹھ صدیوں میں ہندو مسلم میں سے پیدا ہوا۔ اور جس کے نشانات اب روز بروز دُھندلے ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو دو چار سال کے بعد یہ (Research) ایک موضوع ہو کر رہ جائے گا۔ عملی دُنیا میں صفر سے زیادہ اسکی اہمیّت نہ ہوگی۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، پر ہوا کا رُخ یہی ہے۔ واقعات کو جھٹلانے کی ہمّت نہیں۔

نتائج

اچھا صاحب! ہم نے مانا کہ آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ہندو مسلمانوں کی معاشرت ایک ہو چکی تھی، ان کی تہذیب و شائستگی یکساں تھی، زبان و عادات سب اتحاد کے قالب میں ڈھل چکے تھے۔ ایک متحدہ قوم کا صرف تصوّر نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں صرف ایک قوم تھی، یہ سب ہم نے مانا۔ پھر اس کا نتیجہ؟ یہ سب تو پچھلی باتیں تھیں۔ اب نہ تو وہ فضا ہے نہ صورتِ حال تو عرض کرنا یہ ہے کہ ملک کی موجودہ صورتِ حال کتنی ہی خراب اور فضا کیسی ہی بدلی ہوئی ہو، ہم جو ملک کی خدمت کو نکلے ہیں، دیس کے اصلی مفاد سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے، ہم جو انگریزوں سے لڑنے اور ملک کو آزادی دلانے کا تہیّہ کر کے میدان میں آئے تھے سنگین حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آزادی کا لفظ کتنا ہی میٹھا اور موہنے والا ہو، پر صرف اسکے سہارے ملک کی آئندہ تعمیر

نہیں ہوسکتی۔ غیر ملکی سامراج کے نام پر جذبات سے اپیل کر کے ملک کو آزادی کے قریب تو لایا جاسکتا ہے لیکن امن وسکون صرف آزادی کے نام پر میّسر نہیں آسکتا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ نہرو رپورٹ کے اختلافات کے باوجود دیس میں ایسی جوتی بیزار نہ تھی اور آج وزارتیں قبول کرنے کے بعد سارے ملک میں جماعت بندیوں اور فرقہ وارانہ لڑائیوں کا بازار گرم ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے آزادی کی بنیاد کھوکھلی رکھّی ہے دو جماعتیں ایک دوسرے سے الگ بلکہ مخالف راہوں میں جارہی ہیں۔ اگر وہ کچھ دیر کے لئے تیسری طاقت کے مقابلہ میں صف آرا ہو بھی جائیں تو بنیاد کھوکھلی ہی رہے گی اور جو بھی سپاہی لڑائی سے ذرا دم لیں گے آپس میں..... بات بات پر سر پھٹّول کرنے لگیں گے۔ جیسا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں عارضی اتحّاد کے بعد یہ سماں ظہور پذیر ہوچکا ہے یہی بات اب ہورہی ہے ملک جیوں جیوں آزادی کی منزل سے نزدیک ہوتا جارہا ہے بدگمانیوں اور پھوٹ میں بھی بڑھوتی ہوتی جارہی ہے، ہم نے مستقبل کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف ایک قوم کے مزاج سے ملتا ہے، دوسرا نقشہ کو دیکھکر بدکتا ہی ہچکچاتا ہے کہ اسمیں اسکے لئے کوئی جگہ نہیں ہم ایک طرف ملک اور جنتا کو آزادی کے نام پر بلاتے ہیں اور دوسری طرف آئندہ زندگی کا نقشہ صرف ایک جماعت کے خیال کے مطابق بناتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ایک گروہ جو تعداد میں کم ہے، بدگمان ہوتا ہے اور بدگمانی میں وہ اُلٹا چلنے لگتا ہے ذرا صاف صاف کیوں نہ کہا جائے۔ کیونکہ بلا کھل کر کہے ہوئے مطلب صاف نہیں ہوگا۔ ہمکو جب مل کر کام کرنا ہے تو ایک دوسرے کی باتیں صاف صاف سننا پڑیں گی۔ دیس کی سب سے بڑی جماعت کانگریس آزادی کے لئے لڑائی لڑتی رہی ہے قدرتی طور پر اس

کے سپاہی کم و بیش ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی سب ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں آزادی کا لفظ عام پسند تھا۔ تمام جماعتیں کود پڑیں۔ مسلمانوں نے تناسب سے زیادہ قربانیاں دیں۔ صرف اتحاد اور سوراج کے نام پر یہ لڑائی لڑی گئی تھی۔ اس وقت کوئی دوسرا فکری تصور سامنے نہ تھا۔ جوں ہی ۱۹۲۳ء میں شدھی سنگھٹن اور تبلیغ کی وبا چلی، دونوں جماعتیں الگ الگ کیمپوں میں خیمہ زن ہو گئیں۔ گاندھی جی ایک نہایت ایماندار اور شریف ترین انسان ہیں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ان سے زیادہ ہندو مسلم اتحاد کا حامی کوئی دوسرا نہیں۔ وہ ہندوؤں کی ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ترقی بھی چاہتے ہیں۔ جو شخص انسانیت کا دوست ہو وہ کسی قوم یا گروہ کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اور اگر مسلمانوں نے خواہ مخواہ ان کو اپنا دشمن سمجھ کر ان سے علیحدگی نہ اختیار کی ہوتی تو آج وہ مسلمانوں کی بہت کچھ خدمت کرتے۔ مسلمانوں کی اس بڑی اور صریح غلطی کی شہادت آئندہ تاریخ دے گی اور مسلمانوں پر ملامت کرے گی۔ لیکن اس پر کسی نے بھی غور نہیں کیا کہ مسلمانوں سے ایسی بدیہی اور صریح غلطی کیوں ہوئی۔ چونکہ گاندھی جی صرف ایک سیاسی رہنما نہیں ہیں، وہ ہندوستان کی آئندہ سماجی زندگی کا ایک نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ اور اسی نمونہ کی طرف ملک کو لے جانا چاہتے ہیں۔ جو نقشہ ان کے ہاتھ میں ہے یا کم از کم مسلمانوں نے ہندوستان کی آئندہ سماجی زندگی کے جس نقشے کو ان کے ہاتھ میں دیکھا ہے وہ اُس سے بدگمان ہو گئے ہیں۔ اس نقشہ میں مسلمان اپنی جگہ نہیں پاتے۔ اس لئے وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے ممکن ہے مسلمانوں کی علیحدگی سے مجبور ہو کر انھوں نے ایسا کیا ہو یا ایمانداری کے

سلہ تھا ان کا خیال ہو کہ دونوں گروہ اپنے اپنے طریقے پر چل کر ترقی کے مدارج طے کریں۔ جو بات بھی ہو، لیکن ایک غیر جانبدار شخص اسقدر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ہمارے رہنماؤں نے اس معاملہ میں بڑی فاش غلطی کی ہے۔ یہ بات نظر انداز کر دی گئی کہ ہندوستان کی آئندہ سماجی زندگی کا کوئی نیا نقشہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے ایسا نقشہ بنا بنایا تیار ہے اور تقریباً سات آٹھ سو سال سے اس نقشہ کے مطابق ہم اس ملک میں اپنی زندگی اطمینان و سکون سے بسر کر رہے تھے وہ نقشہ پارینہ دفتروں میں بند نہیں ہے بلکہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں عیاں ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہزار برس کے میل جول سے جو تہذیب و کلچر پیدا ہوا اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور ہزار برس کی کامیاب کوششوں کو چھوڑ کر دو تین ہزار برس پہلے کے طریقہ بود و باش کو اختیار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے چونکہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں آزادی کی منزل بہت دور تھی۔ اس لئے آزادی پسند مسلمان بہت جوش و خروش سے کانگریس میں شریک رہے۔ نہرو رپورٹ کے بعد یہی بدگمانی مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم جیسے آزادی کے آزمودہ کار جرنلوں کو ہوئی اور آخر وہ اپنے آخری دنوں میں کانگریس کی سرگرمیوں سے الگ ہی رہے۔ لیکن پھر بھی اس وقت تک منزل دور تھی۔ اس لئے بڑی جماعت قومی جھنڈے کے تلے جنگ کرتی رہی۔ ۳۲-۱۹۳۰ء کی جنگ آزادی میں ہزاروں مسلمان شریک ہوئے اور سینکڑوں اس راہ میں شہید ہوئے

مسلمانوں کی بدگمانی خاص طور پر اسوقت سے شروع ہوتی ہے یا حد سے بڑھتی ہے جب کانگریس اختیارات پا کر اپنا کام شروع کرتی ہے۔ وزارتوں

کے قبول کرنے سے دو باتیں خاص کر مسلمانوں پر ظاہر ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اب آزادی کوئی دور دراز کی چیز نہیں رہی۔ دوسرے یہ کہ کانگریس کے سامنے ہندوستان کی سماجی زندگی کا جو خاکہ ہے اس کی ایک جھلک نگاہوں کے سامنے آگئی۔ ان کو خیال ہونے لگا کہ ہزار سالہ متحدہ زندگی کو نظر انداز کیا جا رہا ہے بس یہی چیز آفت ہوگئی۔ یہ خاکہ جو یکسر ہندوستان کے پرانے طرزِ معاشرت کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو سراسیمہ و بدگمان کئے ہوئے ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہزار برس کے میل جول اور دو قوموں کی ملی جلی کوششوں سے جو شائستہ تہذیب اور ڈھلی ہوئی زبان وجود میں آئی تھی اور جو ہندو مسلمانوں کو متحد و متفق کرنے میں بہت کچھ کامیاب ہو چکی تھی، اسکو پس پشت ڈال کر اس ہزار سالہ درمیانی کڑی کو چھوڑ کر پرانی تہذیب اور پرانے رسم و رواج کو زندہ کیا جا رہا ہے جب مسلمان یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہزار برس میں ہندوستان کی تعمیر، مصوری، رسم و رواج، لباس، شادی بیاہ اور زبان کے بنانے سنوارنے میں جو کامیاب کوششیں کی تھیں وہ مٹ رہی ہیں تو قدرتی طور پر وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور ایک بحران کی حالت میں مشترک قومی جماعت اور آزادی کی جنگ ہی کو برا کہنے لگتے ہیں۔

یہ حالات ہیں اور یہ فضا ہے، کانگریس کو اس کا حل تلاش کرنا چاہئے ورنہ ملک میں آج یا کل آزادی ملنے کے بعد کبھی سکون اور اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اگر اسی طرح آزادی کے عامیانہ لفظ پر دعوت دی گئی اور ہندوستان کا آئندہ تعمیری نقشہ صرف ایک جماعت کے مزاج اور خیالات کے مطابق بنایا گیا تو

پھر دیس میں خانہ جنگی یقینی ہے۔ یہ جو آپ ہندو ہندستان اور مسلم ہندوستان کے نعرے سنتے ہیں، وہ بہت کم ہیں، اس خلفشار اور بدامنی کے مقابلہ میں جو کل پیدا ہو سکتی ہے، اگر خدانخواستہ یہی حالات رہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ کانگریس کو اس کا حل تلاش کرنا چاہئے لیکن یہ سُن کر بعض لوگوں کو شاید تعجب ہو کہ زمانۂ وسطیٰ کے سیاست دانوں نے اس کا حل اُسی وقت تلاش کر لیا تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی تعمیر بالکل مشترک رسم و رواج، مشترک زبان اور مشترک تہذیب کی بنیادوں پر کی، اور اس ملی جُلی تہذیب کے بنانے اور سنوارنے میں بڑی کوششیں صرف کیں۔ یہ سیاست داں یہ راز اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اس ملک میں امن و سکون کی مہذب اور ترقی یافتہ زندگی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس زندگی کے بنانے اور سنوارنے میں دونوں قوموں کا حصّہ نہ ہو۔ گو مغلیہ حکومت سے قبل ہی ایک تہذیب بن رہی تھی لیکن مغلوں کے زمانے میں یہ بناوٹ تکمیل کو پہونچ گئی۔

ہندوستان کی اس دَور کی تہذیب اپنی نرمی، خوبصورتی اور سندرتا میں دنیا کی اچھی سے اچھی......... تہذیب کو شرمانے لگی۔ ایک ڈھلی ہوئی زبان اور ایک" تاج" اس تہذیب کی شائستگی اور لطافت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ حل جو آج سے کئی سو برس پہلے اُس وقت کے اہلِ سیاست اور حکمرانوں نے تلاش کر لیا تھا وہی آج بھی ان مشکلات کا حل ہے، اسی راہ پر چل کر ہم آج بھی منزل پر پہونچ سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی قومیت کو ہندو مسلم

تہذیب کی بنیادوں پر سنوارا جائے اور مسلمانوں کی تہذیبی خدمتوں —— (Cultural contribution) کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اِس طرح جو تہذیب پیدا ہوگی اُسے ہندو مسلم دونوں آنکھوں سے لگائیں گے کہ یہ دونوں کی صدیوں کی کوششوں کی یادگار ہے اور پھر دونوں دوش بدوش آئندہ ہندوستان کی تعمیر میں مل کر کام بھی کرسکیں گے۔ اس کے یہ ہرگز معنی نہیں کہ مسلمان ہر اُس چیز سے جو پُرانی ہندو تہذیب و شائستگی سے تعلق رکھتی ہے کُلّی طور پر علیحدگی اختیار کریں۔ ہندو کلچر اور ہندو تہذیب و شائستگی خوبیوں سے مالامال ہے۔ اس سمندر میں غوطہ لگانے سے آج بھی ایسے انمول موتی ملتے ہیں جن کی مثال دُنیا پیش نہیں کرسکتی۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو علم و تہذیب کے اس سمندر میں غوطہ لگا کر قیمتی جواہرات حاصل کرنے چاہئیں اور بحیثیت ہندوستانی ہونے کے انکو بھی ہندوستان پر ویسا ہی فخر ہونا چاہئے جیسا کہ ہندوؤں کو۔ سنسکرت زبان کو اسی شوق سے مسلمانوں کو بھی پڑھنا چاہئے جیسا کہ ہندوؤں کو نالندہ اور ٹکسیلا و دکرم شیلا کے ودیاپیٹھ کے شاندار کارنامے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی باعثِ فخر ہیں، جیسے کہ ہندوؤں کے لئے ایرانی آج مسلمان ہیں لیکن ان کو اپنے ملک کی ایرانی زبان اور پُرانی تہذیب "پہلوی" پر بے حد فخر ہے۔ ترک مسلمان ہیں لیکن وہ اپنی پُرانی تاتاری زبان کو بھولے نہیں۔ مصری مسلمان ہیں لیکن وہ اپنی پُرانی مصری تہذیب پر فخر کرتے ہیں اس لئے آج اگر ہندوستانی مسلمان ہند کی قدیم تہذیب و شائستگی پر جو دُنیا میں بعض صورتوں کے لحاظ سے صرف اپنی ایک نظیر ہے فخر نہیں کرتے تو اس کا الزام اسلام پر نہیں آسکتا یہ تو گذشتہ دو سو برس کی انگریزی سیاست کا اثر ہے۔ خود انڈو مسلم کلچر

ہندو مسلم تہذیب و شائستگی کی بلندی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس لئے کہ مسلمان جہاں گئے، انھوں نے اپنا لباس، اپنی زبان، اپنی تہذیب کے گہرے نقوش چھوڑے، صرف اسی ملک میں ان کو ایک ایسی بلند پایہ تہذیب سے دوچار ہونا پڑا جس کو وہ فتح نہ کر سکے، بلکہ مصنفِ "تمدنِ ہند" کی زبان میں خود اس سے مفتوح ہو گئے۔ ان تمام باتوں کے بعد بھی اگر ہم کو اس ملک میں ایک قومیّت قائم کرنا ہے تو پھر ہمکو انڈو مسلم کلچر ہی کا ذریعہ پکڑنا ہوگا۔ اسلام جہاں بھی گیا، اس نے اکثریت و اقلیت کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اکثریت کا خوف اسلامی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے۔ اکثریت کے اس خوف کی تہ میں وہی ہندو اسپرٹ کام کر رہی ہے جو نیچی ذات والوں کو ہمیشہ اونچی ذات والوں سے رہا ہے۔ مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کی روشنی میں اس خوف کو ہمیشہ کے لئے اور جلد از جلد اپنے دل و دماغ سے دور کر دینا چاہئے۔

لیکن یہ بات ہم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ قومیّت صرف آزادی کی بنیاد پر کسی طرح نہیں قائم ہو سکتی۔ مسلمانوں کو جب اس ملک میں اقتدار حاصل تھا اس وقت انھوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون کی بڑی خدمت کی۔ البیرونی و فیضی سے لیکر سیّد علی بلگرامی تک بہت سے ایسے مسلم وِدوانوں (عالموں) کے ناموں سے ہر شخص واقف ہے۔ جنھوں نے سنسکرت پڑھنے اور اس زبان کے علوم و فنون حاصل کرنے میں اپنی عمریں صرف کر دیں امیر خسرو سے لے کر سیّد انشاء اور نظیر اکبر آبادی تک پرانی ہندی زبان کی خدمت کرنے میں مسلمانوں نے کوتاہی نہیں کی۔ رحیمن، داؤد، کبیر اور رس کھان

وغیرہ نے ہندی زبان کی تلسی داس وغیرہ سے کم خدمت نہیں کی۔ آج بھی نذرالاسلام بنگلہ زبان کی خدمت کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے، اگر وہ دماغی بے اطمینانی اور شبہات جن کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے، ہٹ جائیں تو مسلمان آج بھی سنسکرت اور نئی ہندی کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہیں گے۔ لیکن یہ کام زبردستی نہیں ہو سکتا۔ اس ملک میں مسلمان آج ہر حیثیت سے پسماندہ ہیں اور ہندوؤں کی حالت ان سے ہر حیثیت سے بہتر ہے، اس لئے ان کی دماغی بے اطمینانی اور شبہات رفع کرنے کی ذمہ داری ہندوؤں پر عائد ہوتی ہے۔

سیّد محمود

مطبوعہ یونائیٹڈ فائن آرٹ لیتھو گرافرس۔ مجگاؤں۔ بمبئی نمبر ۱

زندگی اور ادب کی جدید اور جدید تر قدروں کا محافظ
فکر و تنقید، تعمیر و تخلیق اور توازن و ترقی

ماہنامہ ایشیا باتصویر

کے ترکیبی عناصر ہیں

اور اسی لئے

ایشیا ہماری نہیں، عوام کی عزیز ملک ہے

ایشیا کو اردو اور ہندی کے بڑے سے بڑے اور نئے سے نئے ادیب و شاعر کی حمایت و تعاون حاصل ہے

ایشیا کا مفکرانہ ادب پرانے اور تازہ دم تقلیدی ادب سے آگے اِک نیا قدم ہے

وہ جماعتی پروپیگنڈے سے بلند ہو کر معاشی و سماجی اور